Regd. L. No.7243
Phone 880[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1984

اس پرچہ میں

(۱) فتنۂ انکارِ سنت

(۲) ایک کمیونسٹ نوجوان سے

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی، گلبرگ-۲، لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	بدل اشتراک
۴ چار روپے		سالانہ پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے
شمارہ ۳	مارچ ۱۹۸۴ء	جلد ۳۷

فہرست

لمعات - (قوانین ساز حضرات کی خدمت میں) ۲
اُردو میں نماز (محترم پرویز صاحب) ۱۷
فتنۂ انکارِ سنت ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ۲۶
اقبالؒ کا پاکستان ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ۳۴
ایک کمیونسٹ نوجوان سے ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ۴۴
نگۂ بازگشت (در انجمنِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل) ۴۹
حقائق و عبر (حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے) ۶۱
درسِ قرآن کریم کے اعلانات ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ـــ ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید- مقام اشاعت- ۲۵ بی گلبرگ نمبر۲ لاہور- مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹- ایبک روڈ لاہور

لمعات

قانون ساز حضرات کی خدمت میں

(آپ نے خدا کے ہاں جواب دینا ہے)

مملکتیں وجود میں آتی ہیں، مملکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں قائم ہوتی ہیں، سلطنتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ حکومتیں بنتی ہیں، حکومتیں ٹوٹتی ہیں۔ یہ تاریخ کی گردشِ دولابی ہے جو شروع سے آج تک جاری و ساری ہے۔ حکومتوں کے نفع بخش کارناموں کی یاد، ان کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں رہتی اور زبان پر آتی ہے۔ ان کے مظالم کا رونا خود ان کی موجودگی میں بھی رویا جاتا ہے۔ ان کے مرتب اور نافذ کردہ قوانین بھی اپنی مدتِ عمر ختم کرنے کے بعد صفحۂ تاریخ سے مٹ جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے قوانین لے لیتے ہیں۔ اس تبدیلی میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں لگتا کیونکہ زمانے کے تقاضے جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی حکومت جو لکیریں مذہب کے نام سے کھینچ دیتی ہے ان کی عمر بڑی دراز ہوتی ہے اور (اگر وہ غلط تھیں تو) ان کی تباہ کاریوں کا سلسلہ بھی مدتِ مدید تک جاری رہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ مذہب کا تعلق انسان کے لطیف ترین جذبات سے ہوتا ہے اور ان کے پیدا کردہ نقوش مٹتے مٹتے بھی صدیاں لے لیتے ہیں۔

قرآنِ مجید نے اس سلسلۂ محو و ثبات کے لئے ایک نئی طرح ڈالی۔ اس نے کچھ اقدار متعین کیں اور کچھ اصول عطا فرمائے جن کے متعلق کہہ دیا کہ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ۔ یہ کبھی تبدیل نہیں ہو سکیں گے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ ۔ حکومتیں آئیں اور جائیں۔ ان کے آئین و دساتیر بدلتے رہیں۔ لیکن ان ابدی اصول و اقدار کو کوئی حکومت بدل نہیں سکے گی۔ ان کا نام اسلام ہے اور ان کے مطابق قائم کردہ نظام کا نام الدّین۔ الدّین کے یہ اصول و اقدار غیر متبدّل رہیں گے، ان کے نفاذ کے طور طریق بدلتے جائیں گے۔ جس حکومت کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا، وہ اسلامی حکومت کہلائے گی۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہوگی، تو قرآنی اقدار و اصول، قرآن کے صفحات میں محفوظ رہیں گے۔ اور ان کے نفاذ کے لئے جو طرق و اسالیب (سابقہ) اسلامی حکومت نے وضع اور نافذ کئے تھے ان کی اسلامی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ ان کی حیثیت، مذہبی رسوم و مناسک کی رہ جائے گی۔ یہ وہ قدرِ مشترک ہوگی جس کے ساتھ تمسّک، یا جس کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے سے۔ اتنا ہی ہوگا کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والی قوم کا تشخّص باقی رہے گا۔ ان رسوم و مناسک کو ابدی اور غیر متبدّل سمجھ لینا انہیں کتاب اللہ

کے ہم پلہ قرار دینا ہوگا جو شرک ہے۔

اسلامی حکومت، حضور نبی اکرم صلعم کے عہد ہمایوں میں قائم ہوئی اور کچھ عرصہ بعد تک باقی رہی۔ اس حکومت میں حکمرانی صرف کتاب اللہ کی تھی۔ کتاب۔ اللہ کے احکام و اصول و اقدار کو نافذ کرنے کے لئے جو طور طریق اختیار کئے گئے تھے (جنہیں آپ جزئی قوانین شریعت کہہ لیجئے) انہیں نہ غیر متبدل قرار دیا گیا تھا نہ انہیں علیٰ حالہ قائم رکھا گیا۔ یہ وجہ تھی کہ اس دور میں کتاب اللہ کی حفاظت کا تو اس قدر اہتمام کیا گیا لیکن ان جزئی قوانین کو نہ کہیں مرتب و مدون کیا گیا، نہ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا۔ انہیں زمانے کے تقاضوں کے تحت بدلتے رہنا تھا اس لئے انہیں منضبط کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث رسول اللہ یا عہد خلافت راشدہ میں جاری کردہ احکام کا کوئی مجموعہ اس زمانے میں منضبط تحریر میں نہیں لایا گیا، تو اس کی وجہ ہی یہ تھی۔ جس چیز کو غیر متبدل رہنا تھا (یعنی کتاب اللہ) اس کی نشر و اشاعت اور نظم و ضبط کا انہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ (امام ابن حزمؒ کے قول کے مطابق) عہد فاروقیؓ میں مملکت میں قرآن مجید کے قریب ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اس دور کے بدلتے رہنے والے احکام کی ایک چٹ بھی کہیں نہیں ملتی۔

اس کے بعد بنو امیہ کا دور آیا۔ اس دور حکومت کا جو نہایت بھیانک نقشہ تاریخ میں کھینچا گیا ہے، ہم سر دست اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم اس کی صرف ایک خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے بھی اپنے احکام حکومت کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں کیا۔ اور جب مرتب ہی نہیں کیا تو اس کی حفاظت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا۔ آپ اس دور میں نہ کسی خاص فقہی مذہب کا نشان دیکھیں گے، نہ فقہی قوانین کے کسی مجموعہ کا تذکرہ۔ انہوں نے بھی قرآن ہی کی حفاظت کی اور اسی کو آگے پہنچایا۔ یہ وجہ ہے جو اس دور میں نہ امت میں فرقے پیدا ہوئے، نہ فرقہ وارانہ فقہیں وجود میں آئیں۔

اس کے بعد عباسی دور ہمارے سامنے آتا ہے جو سابقہ ادوار سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ ان کی حکومت بھی اسلامی نہیں تھی۔ کیونکہ ملوکیت اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں جو یکجا ہو ہی نہیں سکتے۔ لیکن اس دور میں مختلف فقہیں مرتب ہوئیں۔ ان کی وجہ سے امت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ توحید نام تھا ایک کتاب اللہ کی حکمرانی کا۔ جب اس کی حکمرانی نہ رہی تو امت میں توحید بھی باقی نہ رہی — توحید تو ایک طرف، امت کی وحدت بھی باقی نہ رہی۔ وہ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی وغیرہ گروہوں میں بٹ گئی۔ یہی وہ فرقہ بندی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے شرک قرار دیا تھا۔ جوں جوں یہ دور آگے بڑھتا گیا، امت کا انتشار، خلفشار، افتراق، اختلاف بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اب امت کا کوئی فرد، صرف مسلم کے نام سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اسے بتانا پڑتا تھا کہ کونسا مسلمان —— شیعہ۔ سنی۔ اہل حدیث۔ اہل فقہ۔ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی (اور نہ جانے کتنی اور اضافی نسبتیں)۔

عباسی دور حکومت ختم ہو گیا لیکن اس دور میں پیدا شدہ مختلف فقہیں اور ان کی نسبت سے مختلف

فرقے آگے چلتے گئے۔ اب انہی فقہوں کا نام اسلام ہے اور ان کے پیروؤں کا نام مسلمان۔ اور نظامِ حکومت، ملوکیت۔ یعنی مسلمانوں کی زندگی، اصول اور فروع، دونوں اعتبار سے خلافِ اسلام! یہ فقہی احکام چونکہ زمانے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق یہ آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے تھے۔ اس کی جگہ مسلمان مملکتوں نے اپنے یہاں سیکولر نظام رائج کر لیا۔ یعنی قرآن کی طرف وہ پھر بھی نہیں آئیں۔ قرآن کی طرف وہ آ بھی نہیں سکتی تھیں۔ قرآن تو ہر قسم کی شخصی حکومت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔

مدت سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماعی کی یہی صورت ہے ــــــ یعنی نظامِ حکومت، ملوکیت یا سیکولر ہے۔ اور اس میں شخصی قوانین کی حد تک کسی نہ کسی فقہ کے احکام کارفرما۔ قرآن کا مصرف، صرف یہ رہ گیا ہے۔

کہ از یٰسینِ او آساں بمیری۔

ــــــ (۰) ــــــ

اس صورتِ احوال کی شدتِ احساس کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے ایک ایسی جدید مملکت کا تصور دیا جس میں حکمرانی کتاب اللہ کی ہو اور اس طرح اسلام اپنی حقیقی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے آ سکے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس مملکت میں قرآنی قوانین نافذ ہوں گے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ جب یہاں قانون سازی کا وقت آیا تو نہ علامہ اقبالؒ موجود تھے نہ قائداعظم علیہ الرحمۃ۔

عام پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ یہاں تیس سال میں کسی حکومت نے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر کبھی پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے حالات سازگار ہوئے تو ہم بتائیں گے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کیوں نہ ہوئے اور یہ کتنی بڑی سازش تھی جس کے نتیجہ میں یہ مملکت قرآنی نہ بن سکی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ جس مملکت میں مسلمانوں کے مختلف فرقے بستے ہوں وہاں کونسے اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں؟ اس سوال کا جواب مہیا کرنے کے لئے، ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندہ (۳۱) علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں متفقہ طور پر یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ ملک کے لئے ضابطہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اس ریزولیوشن کے بعد دھوم مچا دی گئی کہ علماء حضرات نے اتمامِ حجت کر دیا ہے۔ اب اگر اسلامی قوانین نافذ نہیں کئے جاتے تو اس سے اربابِ حکومت کی بدنیتی واضح ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ ریزولیوشن درحقیقت بہت بڑا سراب ہے۔ یہ حضرات جانتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے (حتیٰ کہ یہی علماء جنہوں نے اس ریزولیوشن پر دستخط کئے ہیں) متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ یہ حضرات جانتے تھے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن وہ اس کا اعتراف کیسی طرح کر لیتے؟ ان کی طرف سے اس کا جواب تو کوئی نہ دیا گیا، عافیت اسی میں سمجھی گئی کہ مشہور کر دیا جائے کہ یہ لوگ منکرِ حدیث ہیں۔ اور اس طرح قوم کی توجہ دوسری طرف منتقل کر دی جائے۔

اس دوران میں ایک دفعہ (مرحوم) صدر ایوب نے یہ پیشکش بھی کر دی کہ اگر علما حضرات ایک متفقہ علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر دیں تو وہ اس پر آنکھیں بند کرکے دستخط کر دیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ شخص علما کے خلاف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے!

وقت گزرتا گیا اور ان حضرات کی طرف سے ہر حکومت کے خلاف یہ پراپیگنڈہ جاری رہا کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کے خلاف انکارِ حدیث کا خود ساختہ الزام بھی۔ تاآنکہ ۱۹۷۰ء میں (مرحوم) مودودی صاحب کو اس کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے واقعی کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفق طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ علما حضرات میں سے کسی نے نہ ان کے اس اعلان کی تردید کی، نہ انہیں منکرِ حدیث قرار دیا۔

مرحوم سے پوچھا گیا کہ پھر مملکت میں اسلامی قوانین کس طرح نافذ ہونگے، تو انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے (حالانکہ وہ خود فقہ حنفی کے سخت خلاف تھے) گویا کتاب و سنت کی رو سے مرتب کردہ ضابطہ قوانین کو تمام فرقے اسلامی تسلیم نہیں کرینگے۔ فقہ حنفی کو تمام فرقے اسلامی تسلیم کرکے اس کی اطاعت قبول کر لیں گے!

کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب آپ جانتے تھے کہ کتاب و سنت کے مطابق ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو آپ نے (i) ۱۹۵۱ء والے ریزولیشن پر دستخط کیوں ثبت فرمائے تھے۔ (ii) بیس سال تک ہر حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کیوں کرتے رہے کہ وہ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے۔ اور (iii) اب جو آپ مشورہ دے رہے ہیں کہ ملک میں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کر دی جائے تو کیا یہ تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہوگی؟ کسی نے ان سے اتنا نہ پوچھا! اصل یہ ہے کہ ہماری قوم اسلام کی طرف سے کچھ ایسی دل برداشتہ ہو کر بے دور ہو چکی ہے کہ وہ مذہب سے متعلق امور کو (SERIOUSLY) لیتی ہی نہیں حالانکہ یہ وہ گوشہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے لئے سانس لینے سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سابقہ حکومتیں جانتی تھیں کہ جس ملک میں مختلف فرقوں کے لوگ آباد ہوں وہاں کسی ایک فقہ کو قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کر دینے کا نتیجہ کیا ہوگا، اس لئے انہوں نے اس مشورہ یا تجویز کو قابلِ پذیرائی نہ سمجھا۔ موجودہ حکومت نے البتہ اس پر عملدرآمد کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ جو آب ملک میں اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت وغیرہ کے چرچے سن رہے ہیں، اس سے درحقیقت مراد فقہ حنفی کا اجرا ہے۔ اور اس کے نتائج ابھی سے سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے چند قوانین "حدود (سزاؤں)" سے متعلق نافذ کئے گئے جو نا قابلِ عمل ثابت ہوئے۔ زکوٰۃ کے متعلق احکام نافذ کئے گئے تو ان کے خلاف اس شدت سے احتجاج ہوا کہ حکومت کو اس کی اجازت دینی پڑی کہ ہر شخص اپنی فقہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے یعنی یہ بھی مملکت کا قانون نہ بن سکا۔ اب "قصاص" وغیرہ سے متعلق مجوزہ قوانین کا مسودہ ملک میں گشت کر رہا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کے خلاف ہزاروں کی تعداد میں تجاویز موصول ہو رہی ہیں۔

ہمارا تعلق کسی فرقہ سے نہیں اس لئے ہمارے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم فلاں فقہ کے حق میں ہیں اور فلاں کے خلاف۔ نہ ہی ہم ملک کی عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں جو یہ سمجھا جائے کہ ہم سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکومت کے خلاف تنقید کرتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور قرآن کریم کو دین میں سند اور حجت تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قرآن کی رو سے ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جہاں کوئی ایسی بات اسلام کی طرف منسوب کی جا رہی ہو جو قرآن کے خلاف ہو، ہم اس کی نشاندہی کریں اور مخالفت بھی۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ہم اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے ہیں۔ بارگاہِ خداوندی میں اسی جوابدہی کا احساس ہے جس کی رو سے ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ یہاں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے اس کا جائزہ لے کر یہ بتائیں کہ اس میں فلاں بات قرآن کے خلاف ہے۔ اگر حکومت اپنے قوانین کو محض قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرے تو ہمارے جائزہ کا انداز اور ہوگا۔ لیکن اگر انہیں اسلامی قوانین کہہ کر نافذ کیا جائے تو پھر ہم پر لازم آجاتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں

ان کا جائزہ لیا جائے۔ یہی ان سطور کی تسوید سے مقصود ہے اور اس میں ہمارا اولیں روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے جو ان قوانین کو مدوّن کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں حکومت بھی برابر کی ذمہ دار ہوتی ہے بلکہ قوانین مرتب کرنے والوں سے بھی زیادہ ذمہ دار، لیکن چونکہ قانون سازی کا آغاز، ان کے مرتب کرنے والوں کی طرف سے ہوتا ہے اور وہی انہیں "اسلامی قوانین" کہہ کر حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں، اس لئے ہم سب سے پہلے انہی حضرات کو درخورِ توجہ سمجھتے ہیں۔ امید ہے وہ ہماری ان گذارشات پر بہ تقاضائے ایمان، غور فرمائیں گے۔

(۱)

اس سلسلہ میں قدمِ اوّل یہ ہے کہ اسلامی قانون اسے کہیں گے جو اسلامی حکومت کی طرف سے نافذ ہو۔ اگر کوئی قانون، قرآن، سنت، فقہ کے مطابق بھی ہو لیکن وہ نافذ ہو کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے، تو اسے اسلامی قانون نہیں کہا جائے گا۔ (مثلاً) اگر بھارت میں شراب کی قانوناً ممنوع قرار دیا جائے، تو اس حکومت کے قانون کو اسلامی نہیں کہا جائے گا، حالانکہ اس کے مطابقِ اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کے نفاذ کے لئے، جماعتِ مومنین کی اپنی آزاد مملکت کے قیام کو لاینفک قرار دیا۔ اسلامی مملکت کے قیام سے، درحقیقت ایک نظام قائم یا ایسی فضا پیدا ہوتی ہے جو منشاءِ خداوندی کو پورا کرتی ہے۔ احکامِ خداوندی اسی نظام یا فضا میں نافذ ہونے سے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ اور وہ مقصد ہوتا ہے افرادِ معاشرہ کے قلب و نگاہ میں صحیح تغیر۔ ان قوانین یا احکام کو غیر اسلامی فضا میں میکانکی طور پر نافذ کرنے سے یہ مقصد حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کیوں کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ...... (۲/۱۷۷) "نیکی یا کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف ....." اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ خداوندی کی میکانکی طور پر ادائیگی سے ان کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ مقصد پورا ہوتا ہے قلب و نگاہ کی تبدیلی سے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے (آیت کے اگلے حصے میں یہی کہا گیا ہے)۔ اور یہ تبدیلی ہوتی ہے اُمّت کے اجتماعی نظام کے اندر رہتے ہوئے جو قرآن کے ساتھ وابستگی اور پیوستگی سے وجود میں آتا ہے۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ (۳/۱۰۳) کتابِ خداوندی کے ساتھ وابستگی کے ساتھ جَمِيعًا کی شرط کے معنی یہ ہیں کہ ان احکام کا مقصد، جماعتِ مومنین کے اجتماعی نظام ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے دین نہ انفرادی ہے اور نہ ہی غیر اسلامی نظام یا حکومت میں اس پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔

لہٰذا۔ (۱) احکامِ خداوندی اس وقت اسلامی کہلا سکتے ہیں، جب وہ اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہوں۔

(۲) یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک مملکت کے اسلامی ہونے کی شرط کیا ہے؟ یعنی اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں فرق کیا ہے؟ اس کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ نے کھلے کھلے الفاظ میں کر دی ——— پہلے کہا:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵/۴۷)

اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

پھر فرمایا:۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۵/۴۵)

اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

اور آخر میں دو ٹوک الفاظ میں اس فیصلہ کن حقیقت کا اعلان فرما دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

اور جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

بات واضح ہے کہ

(۱) جو حکومت ما انزل اللہ (جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے) کے مطابق نہیں، اس میں کسی کام کو بھی "نیک عمل" نہیں کہا جا سکتا، خواہ وہ نظر بظاہر، نیک کام ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ وہ حکومت فاسقین کی ہے۔

(۲) ایسی حکومت میں کوئی فیصلہ مبنی بر عدل نہیں کہلا سکتا، کیونکہ وہ ظلم پر مبنی ہے۔

اور — (۳) ایسی حکومت، اسلامی کہلا ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ نظام کافرانہ ہے۔ کفر و اسلام میں بہی، حدِ فاصل ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ "ما انزل اللّٰہ" سے مراد کتاب اللہ (خدا کی کتاب۔ یعنی قرآن مجید) ہے۔ فرمایا:۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ .... فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ .... (۵/۴۸)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔۔۔سو تم لوگوں کے فیصلے اسی ما انزل اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے سوا کسی چیز کو "ما انزل اللہ" کہہ کر نہیں پکارا۔ اسی "ما انزل اللہ" پر نبی اکرمؐ خود ایمان لائے تھے، اور دیگر مومنین بھی۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط (۲/۲۸۵)

رسول اس پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب نے اس کی طرف نازل کیا۔ اور مومن بھی (اسی پر ایمان لانے سے مومن کہلاتے ہیں)۔

اسی کے اتباع کا حکم جماعتِ مومنین (مسلمانوں) کو دیا گیا۔ اور اس کے سوا دوسروں کے اتباع سے منع کیا گیا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ط (۷/۳)

جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اور اس کے سوا کسی اور بزرگ کا اتباع نہ کرو۔

اسی کتاب کو رسول اللہؐ، اُمّت کو دے کر گئے تھے اور اسی کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ اگر تم اس کے ساتھ متمسک رہے تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ حضورؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ

قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہ۔ کتاب اللّٰہ۔

(بخاری۔ باب حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے کتاب اللہ۔

خدا نے بھی اُمّتِ مسلمہ کو اسی کتاب کا وارث، بنایا تھا۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ..... (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے اس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ کوئی مملکت اس وقت اسلامی کہلا سکتی ہے جب اس کا تمام کاروبار قرآن مجید کے مطابق سرانجام پاتا ہو۔ وہ چند احکام کے نفاذ سے (خواہ وہ قرآنی ہی کیوں نہ ہوں) اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ اس معاشرہ کو پورے کا پورا اسلامی ہونا چاہیئے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ..... (۲/۲۰۸)

اے جماعتِ مومنین! تم اس امن و سلامتی کے ضامن معاشرہ میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

یہ روش کہ بعض احکام اسلام کے لے لئے، بعض غیر اسلامی رہنے دیئے، بدترین نظام ہے۔ فرمایا:-

..... اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ..... (۲/۸۵)

کیا تم الکتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں شدید ترین عذاب کا مستحق۔

اس میں شبہ نہیں کہ کسی غیر اسلامی معاشرہ کو اسلامی میں تبدیل کرنے کے لئے وقت درکار ہوگا اور یہ پروگرام تدریج اپنی تکمیل تک پہنچے گا۔ لیکن اس تدریج و امہال میں، ترجیحات کے اصول کا مدِنظر رکھنا ضروری ہوگا۔ ان ترجیحات میں، سب سے پہلے (احکام و قوانین کے بجائے) اقدار کی تعلیم و تدریج اور تنفیذ کا مرحلہ سامنے آئے گا۔ اس سے سب سے پہلے ذہنیتیں بدلیں گی۔ پھر قلب و نگاہ میں ایسی نفسیاتی تبدیلی واقعہ ہوگی کہ احکام و قوانین کی پابندی ان افراد کا قلبی تقاضا ہو جائے گا۔ جب اس طرح معاشرہ کی فضا اسلامی ہو جائے گی تو پھر قوانین کے نفاذ کی باری آئے گی اور اس میں بھی تعزیرات کا مقام سب سے آخر میں ہوگا۔ خود قرآنِ کریم کی تنزیل بھی اسی اصول کے مطابق ہوئی تھی حضورؐ کی نبوت کا ابتدائی تیرہ سال کا عرصہ مکہ میں گذرا۔ اس دوران میں وہ سورتیں نازل ہوئیں جن کا مقصد قلب و نگاہ میں تغیر پیدا کرنا تھا یعنی دل و دماغ کو "مسلمان کرنا"۔ حضورؐ کی عمرِ نبوت کا پچاس فیصد سے زیادہ عرصہ اسی مقصدِ عظیم میں گذر گیا۔ اس کے بعد کہیں جا کر (مدنی زندگی میں) احکام و قوانین کی باری آئی۔ یعنی یہ احکام، اسلامی معاشرہ میں نافذ ہوئے۔ اگر انہیں مکی دور میں نافذ کر دیا جاتا تو وہ کبھی نتیجہ پیدا نہ کر سکتے جو مدنی دور میں برق رفتاری سے پیدا ہوتا چلا گیا۔

بخاری میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کہ

پہلے مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت دوزخ کا ذکر ہے۔ (یعنی ترغیب و ترہیب سے

متعلق سورتیں)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب کی ممانعت کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتداء ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے انکار کر دیتے۔ (بخاری - باب تالیف القرآن)

اس قسم کے فیصلے کرتے وقت لوگوں کی افتادِ طبیعت اور جذباتی میلانات کا کس قدر خیال رکھا جاتا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیرِ نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے، اسے ابراہیمی خطوط کے مطابق از سرِ نو تعمیر کر دیا جائے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا:۔

اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اساسِ ابراہیمی پر اس کی تعمیر کرتا اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر لیتا۔ (مسلم۔ باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ اسلامی احکام کے نفاذ میں اصولِ تدریج اور ترجیح کا خیال رکھنا کس قدر ضروری ہے۔

ہم نے پاکستان میں (محاورہ کی رُو سے) گھوڑے کے آگے گاڑی جوت دی۔ یعنی جو کام سب سے آخر میں جا کر کرنے کا تھا، ہم نے ابتداء ہی وہاں سے کر دی۔ یعنی ہم نے ایک غیر مسلم معاشرہ اور مملکت میں اسلامی احکام نافذ کرنے شروع کر دیئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ ان احکام کی افادیت کو ہمارے ذہنوں نے قبول کیا اور نہ ہی ان کی اطاعت کے لیے ہمارے قلوب جھکے۔ بجائے اس کے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے، ہم جھلا اٹھے اور اسے سرکشی اور الحاد و بے دینی پر محمول کرنے لگ گئے۔ اس سے معاشرہ پہلے سے بھی زیادہ غیر اسلامی ہو گیا۔ یعنی پہلے اگر اسلامی احکام کی پابندی نہیں ہوتی تھی تو کم از کم دل میں ان کا احترام ضرور تھا۔ اب ان کے خلاف دلوں میں کبیدگی پیدا ہو گئی اور نئی نسل کے ذہنوں میں سرکشی۔

---(٥)---

اب ہم ان حضرات سے براہِ راست مخاطب ہونا چاہتے ہیں جو پاکستان میں قوانینِ شریعت مدوّن کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ حضرات سب سے پہلے اس حقیقت کا احساس کیجئے کہ اسلامی قوانین مرتب کرنا کتنی عظیم ذمہ داری کا فریضہ ہے۔ سیکولر قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں جوابدہی پارلیمان یا زیادہ سے زیادہ سربراہِ مملکت تک محدود ہوتی ہے، اور اس میں سہو و خطا کا اثر بھی نہ کچھ ایسا دور رس ہوتا ہے، اور نہ ہی اس کا ازالہ چنداں دشوار۔ لیکن اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں جوابدہی بارگاہِ خداوندی میں ہوتی ہے جس کا سلسلہ دراز، اس دنیا سے شروع ہو کر اُخروی زندگی تک پہنچتا ہے۔ ذمہ داری کے اس احساس نے کبھی آپ کے قلب میں لرزش اور روح میں ارتعاش پیدا کیا ہے؟ کیا اس کا خیال کرتے ہوئے آپ کی روح میں کپکپی پیدا ہوتی ہے، یا آپ اس فریضہ کو محض ایک دفاتری (ROUTINE) سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ معاف فرمائیے۔ منظر تو کچھ ایسا ہی آتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کبھی اس قسم کے قوانین مرتب نہ کرتے جن پر علم روتا۔ عقل ماتم کرتی۔ اور قرآن فریاد کناں ہوتا!

پھر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ان قوانین کے اثرات کس قدر دور رس ہیں۔ لوگ ان احکام و قوانین کی اطاعت

اسلامی قوانین یا احکامِ خداوندی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سے وہ جس گمراہی کا شکار ہوتے ہیں، آپ نے کبھی خیال کیا ہے کہ اس سے آپ کے سر پر کس قدر بوجھ لد جاتا ہے؟ سوچیے کہ کہیں آپ کا شمار اس زمرے میں تو نہیں ہو جاتا جس کے متعلق فرمایا کہ

لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ‎(۱۶/۲۵)

وہ اپنی غلط کاریوں کا پورا پورا بوجھ بھی اٹھائے ہوں گے، اور ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی جنہیں انہوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کیا ہوگا۔ سوچو کہ یہ بوجھ کس قدر کمر شکن ہوگا!

(۳) آپ نے گزشتہ صفحات میں دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے:۔

(الف) صرف کتاب اللہ کے مطابق حکومت کو اسلام قرار دیا ہے اور اس کے خلاف ہر حکم، ہر قانون، ہر فیصلہ کو فسق، ظلم اور کفر سے تعبیر کیا ہے! اس نے صرف اسی کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا ہے۔ اس کے سوا اوروں کی اطاعت کو غیر اللہ کی اطاعت کہا ہے۔

(ب) رسول اللہ نے اسی کتاب کی اطاعت خود کی اور اسی کی اطاعت کے لئے مملکت قائم فرمائی۔

(ج) اسی کی اطاعت و اتباع کا حکم اُمتِ مسلمہ کو دیا گیا۔

(د) رسول اللہ نے اسی کتاب کو اپنے پیچھے چھوڑا۔ اس کے ساتھ کسی اور چیز کو واجب الاطاعت قرار نہیں دیا۔

(س) اُمتِ مسلمہ کو اسی کتاب کا وارث قرار دیا گیا۔

(ص) قیامت میں (یہیں دیکھ کر) رسول اللہ کی فریاد یہ ہوگی کہ

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ‎(۲۵/۳۰)

اور رسول کی فریاد ہوگی کہ اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

حضورؐ کی فریاد، ترکِ قرآن کے خلاف ہوگی کسی اور چیز کے ترک کر دینے کا اس میں ذکر نہیں کیونکہ ترکِ اسلام کے معنی ہی ترکِ قرآن ہیں۔

(۴) — آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے قوانین مرتب کرنا جو قرآن کریم کے خلاف ہوں اور انہیں اسلامی قوانین کہہ کر رائج کرنا، کتنا بڑا جرم ہے؟ اس کے تو تصور سے بھی ایک مسلمان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ نے کتنے ایسے قوانین وضع کئے ہیں جو قرآن کریم کے صریحاً خلاف ہیں! ہم نے ان قوانین کی نشاندہی بھی کی لیکن آپ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہ فرمائی۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ آپ اس کے متعلق خدا کے حضور کیا جواب دیں گے؟ اور اس سے اُمت جس قدر گمراہ ہوگی اس کا بوجھ کس کی گردن پہ ہوگا؟

(۵) — آپ جو قوانین نافذ کر رہے ہیں وہ فقہ کے قوانین ہیں، یہ قوانین غیر اسلامی حکومتوں میں، ماہرینِ قوانین (انسانوں) نے وضع کئے تھے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین، کبھی قوانین و احکامِ خداوندی کا درجہ نہیں لے سکتے۔ انہیں ابدی اور غیر متبدل سمجھنا انہیں کلمات اللہ کا درجہ دے دینا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے اس شرک کے خلاف واضح الفاظ میں متنبہ کیا ہے۔ قرآن کریم میں یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا گیا ہے:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۹/۳۱)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو، خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضور نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی بڑا حقیقت کشا ہے۔

حضرت عدیؓ بن حاتم سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا۔ عدیؓ! اس بت کو گلے سے اتار پھینک۔ اس وقت آپ سورۂ برآۃ (توبہ) کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب یہ آیت آئی۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ..... تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال کر دیتے ہیں، اور تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے اسے یہ لوگ حرام کر دیتے ہیں اور تم اسے حرام سمجھنے لگ جاتے ہو۔ میں نے اقرار کیا کہ بے شک واقعہ یہی ہے۔ تو فرمایا۔ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے۔ (جامع بیان العلم۔ ابن عبدالبر)

اب حضرات، ان احبار و رہبان (فقہا حضرات) کے وضع کردہ قوانین کو جو اسلام کا ابدی دین کہہ کر پیش کر رہے ہیں، یہ انہیں خدا بنا دینا ہے۔ جہاں تک ان حضراتؒ کے اقوال ہم تک پہنچے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ خود ان حضرات کا بھی اپنے فیصلوں کے متعلق یہ عقیدہ نہیں تھا۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:۔

امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحب فرماتے ہم اسے لکھ لیا کرتے۔ ایک دن امام صاحب نے ابو یوسف سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے، اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو ابو یوسف سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔ (جلد نمبر ۱۴۔ صفحہ ۲۵۲)

یہ تھا سرخیلِ فقہاء، امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔ یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں اس میں خود امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔ یہ امام صاحبؒ کا مسلک تھا اور آپ حضرات ان کی طرف منسوب فقہ کو ابدی شریعتِ اسلامیہ قرار دے کر ملک میں نافذ کرا رہے ہیں!

فقہی قوانین کو اسلامی شریعت قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ

(۱) اُمت مختلف فرقوں میں بٹ گئی ——— ہر فرقہ اپنی فقہ کے اعتبار سے الگ فرقہ بنتا ہے۔

حالانکہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بالفاظ صریح شرک قرار دیا تھا۔ ارشاد خداوندی ہے..... وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲) "مسلمانو! دیکھنا تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے، اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر کیفیت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ مطمئن ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں اور باقی فرقے باطل پر" اُس نے حضورؐ سے برملا کہہ دیا کہ ——— إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ..... (۶/۱۶۰) "اے رسول! جو لوگ اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود بھی ایک فرقہ سے منسلک ہو جائیں، تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں" یعنی اگر مسلمانوں میں فرقے پیدا ہو جائیں تو نہ خدا کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ باقی رہتا ہے نہ رسولؐ کے ساتھ ——— یہ ہے فقہی قوانین کو دین بنا لینے کا پہلا نتیجہ۔

(۲) فقہ نے اسلامی احکام کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا۔ یعنی پبلک لاز اور پرسنل لاز، حالانکہ اسلام میں اس قسم کی تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سے اور تو اور، خود قرآنی احکام بھی مختلف شقوں میں بٹ گئے۔ (مثلاً) قرآن کریم میں احکام خداوندی کے لئے "کُتِبَ" کا لفظ آیا ہے۔ اب فقہی تقسیم و تفریق ملاحظہ فرمائیے۔

(ا) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ..... (۲/۲۱۶) "مسلمانو! تم پر جنگ فرض قرار دی گئی ہے۔" فقہ کی رو سے یہ پبلک لا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔

(ب) كُتِبَ عَلَيْكُمْ..... الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ..... (۲/۱۸۰) "مسلمانو! تم پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ تم اپنے والدین اور اقربین کے لئے وصیت کرو" ——— فقہ کی رُو سے یہ پرسنل لا ہے۔

(ج) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ..... (۲/۱۸۳) "مسلمانو! تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں" فقہ کی رُو سے اس کا تعلق نہ پبلک لاز سے ہے نہ پرسنل لاز سے۔ یہ عبادات ہیں جو قانون کے دائرے میں نہیں آتیں۔

ان میں فرق یہ ہے کہ پبلک لاز کو مدوّن بھی حکومت کرتی ہے اور نافذ بھی وہی۔ پرسنل لاز فقہ کی رو سے مدوّن ہوتے ہیں لیکن ان کا نفاذ قانونِ حکومت کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اور عبادات کی جزئیات فقہ کی رُو سے مرتب ہوتی ہیں لیکن قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ نہیں ہوتیں۔

(۳) قرآن مجید کے احکام غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۶/۳۴) حتیٰ کہ خود رسول اللہؐ کو بھی ایسا کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ مخالفین نے حضورؐ سے کہا کہ اگر آپ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دیں گے تو ہم مفاہمت کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ان کے جواب میں کہا گیا۔ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۔ یہ قرآن میری کتاب نہیں۔ خدا کی کتاب ہے۔ جب یہ میری کتاب

ہی نہیں تو میں اس میں کس طرح ردّ و بدل کر سکتا ہوں۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ میرا فریضہ تو اس کتاب کا اتباع کرنا ہے۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ٥ (۱۰/۱۵) اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میں بھی خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ ہے قرآنی احکام کے غیر متبدل ہونے کی کیفیت۔ لیکن ہماری فقہ اس میں بھی تبدیلیاں کر دیتی ہے۔ (مثلاً) اسی آیۂ وصیت کو لیجئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ (یعنی ۲/۱۸۰) اس میں کہا گیا ہے کہ ہر مسلمان پر وصیت کرنا فرض ہے۔ وہ اپنی وصیت اپنے پورے کے پورے ترکہ کے لئے کر سکتا ہے' اور اپنے رشتہ داروں اور غیر رشتہ داروں میں سے جن کے حق میں چاہے کر سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے اس پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن ہماری فقہ کا حکم ہے کہ وصیت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی (۱/۳) ترکہ تک کی جا سکتی ہے اور وہ بھی وارثوں میں سے کسی کے حق میں نہیں کی جا سکتی۔ یعنی فقہ، قرآنِ کریم کے حکم میں اس قدر کھلی ہوئی تبدیلی کرتی ہے اور فقہ کا یہی فیصلہ قانونِ حکومت کی رو سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی طرح کئی اور فقہی احکام بھی ہیں، جو یکسر قرآن کے خلاف ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جس مملکت میں :-

۱- مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہوں۔

۲- جہاں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی تفریق ہو۔

۳- جہاں قرآنِ خالص کی جگہ فقہی احکام قانون کی حیثیت سے نافذ ہوں، خواہ وہ قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

نہ وہ مملکت اسلامی کہلا سکتی ہے، نہ اس میں نافذ کردہ قوانین، اسلامی۔ وہ سیکولر اسٹیٹ ہوگی اور اس کے قوانین کی اطاعت یا تعمیل، قوانینِ مملکت کی حیثیت سے کی جائے گی' نہ کہ اسلامی احکام کی حیثیت سے۔

اندریں حالات ہم اپنے ہاں کے واضعینِ قوانین سے بصد احترام پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ جو قوانین وضع کر رہے ہیں انہیں کس طرح اسلامی قوانین قرار دیتے ہیں ـــــ یعنی وہ قوانین جو ہزار سال پہلے کسی غیر اسلامی مملکت میں انسانوں (فقہاء) نے مرتب کئے تھے، اور جن کے قرآنی، ابدی اور غیر متبدل ہونے کی کوئی سند نہیں تھی! ہم نے دسمبر ۱۹۸۰ء میں یہی سوال، محترم تنزیل الرحمٰن سے بھی کیا تھا لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

(۰)

ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہی کہیں گے کہ آپ ایسا نیک نیتی سے کر رہے ہیں (لیکن نیک نیتی سے ہو یا بدنیتی سے غلط کام کا نتیجہ تو بہرحال نقصان رساں ہوگا)۔ آپ کو غالباً اس کا علم نہیں کہ کچھ عرصہ سے اقوامِ مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف ایک گہری سازش کارفرما ہے۔ پچھلی صدی میں مسلمانوں کے مختلف ممالک میں ایسی فکری تحریکیں ابھریں جن کا مقصد یہ تھا کہ جس اسلام پر ہزار سالہ ملوکیت کا ٹھپّہ لگا ہوا ہے، اس کی جگہ قرآنی اسلام رائج کیا جائے ـــــ ترکی میں سعید حلیم پاشا، مصر میں مفتی عبدہ۔ ہندوستان میں سرسیدؒ۔ پاکستان میں اقبالؒ، وغیرہم ـــــ اسی تحریک کے علمبردار تھے۔ اقوامِ مغرب کو اس تحریک میں اپنی استعماریت اور سرمایہ داری کے لئے مہیب خطرہ نظر آتا تھا۔ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے ایک سکیم سوچی جس کا ملخص یہ ہے کہ عہدِ ملوکیت کے اسلام کو حقیقی اسلام قرار دے کر اس کی زور شور سے نشر و اشاعت کی جائے۔ (حالات مساعد

ہونے پر ہم اس کی تفصیل بھی پیش کریں گے)۔ اس کے لئے انہوں نے (FUNDAMENTALISM) کی اصطلاح وضع کی۔ یعنی اسلام کی اساسات کا احیاء۔ یہ جو آپ اس وقت ساری دنیا میں، اسلامی مراکز۔ اسلامی کانفرنسیں۔ اسلامی سیمینار۔ اسلامی مذاکرات۔ اسلامی لٹریچر کی بھرمار دیکھ رہے ہیں اور ان پر سیلاب کی طرح روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے، یہ سب اسی سکیم کی کارفرمائیاں ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ ابھی کل تک ہماری مسجدوں کے دیئوں میں تیل بھی اہلِ محلہ کی خیرات سے ڈالا جاتا تھا اور امام صاحب کا گذارہ انہی کے عطیات پر ہوتا تھا۔ آج یہ حضرات (تبلیغ اسلام کے نام پر) ہوائی جہازوں میں سفر کرتے اور یورپ اور امریکہ کے چوٹی کے ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں تو یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے، اور اس "تبلیغ" پر کیوں خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ سب (FUNDAMENTALISM) کی تحریک کا صدقہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کی نگہ بصیرت نے اسے بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ ان کی آخری تصنیف "ارمغانِ حجاز" میں ان کی معرکہ آرا نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" اس کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں ابلیس کے مشیر اپنی اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں کہ ان کی معلومات کی رُو سے "ابلیسیت" کو کس کس قسم کے خطرات درپیش ہیں — مغرب کا جمہوری نظام، نازی ازم، فاشزم۔ روس کی اشتراکیت وغیرہ۔ وہ ان رپورٹوں کو بڑی توجہ سے سنتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ یہ سب بجا اور درست لیکن تمہاری نگاہ حقیقی خطرہ کو بھانپ نہیں سکی۔ مجھے ان تحریکوں میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ ؎

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے   جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ   کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے!
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس پران مشیروں کی آنکھوں میں خندۂ دزدیدہ دیکھ کر اس نے کہا کہ جو کچھ تم سوچ رہے ہو اس کا مجھے احساس ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ سب جانتا ہوں۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف   ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

یہ تھا وہ خطرہ جو اقوامِ مغرب نے مذکورہ بالا مفکّرین کی دعوتِ الی القرآن میں مضمر دیکھا۔ اس کے توڑ کے لئے انہوں نے —— (FUNDAMENTALISM) کی تحریک ایجاد کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انہیں معتقدات کی نظری بحثوں میں الجھا دو۔ قدیم فقہی مسالک کو عینِ اسلام قرار دے کر انہیں اجاگر کرو۔ ابلیس کے الفاظ میں، انہیں اس قسم کی بحثوں میں اُلجھا دو کہ

ابنِ مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے!   ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے   یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم   اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات!

ان مٹنے والے نقوش کو پھر سے اجاگر کر کے اس قوم کے سامنے لا کھڑا کرو اس طرح ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے   تابساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

اس قدر تاکیدات کے بعد اس نے پھر کہا کہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمّت کی بیداری سے میں　　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اور اس کے لئے آخری (اور حتمی) نسخہ یہ کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے!

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ ہے (FUNDAMENTALISM) کی سازش کا ماحصل جسے اس زور و شور سے پھیلایا جا رہا ہے اور جس سے ہم سطح بیں یہ سمجھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ دنیا میں اسلام کا احیا ہو رہا ہے۔ ہم سادہ لوحوں کو عیّارانِ مغرب کے دامہائے ہمرنگِ زمیں سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ برداشت کر لیں گے، لیکن اس اُمت کا قرآن کی طرف آنا انہیں کبھی گوارا نہیں ہوگا ——— لیکن ان کے لئے گوارا ہو یا نہ، قیامت تو یہ ہے کہ ہمیں بھی گوارا نہیں۔ ہماری حالت ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ (39/45)

جو لوگ حیاتِ آخرت (خدا کی باز پرس) پر یقین نہیں رکھتے، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ حقِ حکومت خدا اور صرف خدا کو حاصل ہے، تو انہیں یہ بات سخت ناگوار گذرتی ہے لیکن جب ان کے سامنے ان کا ذکر کیا جاتا ہے جو قانون سازی میں خدا کے شریک قرار دیئے جاتے ہیں، تو خوشی سے اُن کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ "اَلَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ" (خدا کے سوا قانون ساز) کون ہیں؟ فرمایا: اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ... (42/21)۔ وہ جو ان کے لئے قوانینِ شریعت وضع کرتے ہیں حالانکہ خدا نے انہیں اس کا کوئی اختیار نہیں دیا۔ کہا کہ یہ جو قوانین سازی میں خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہیں، ان سے پوچھو کہ

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ... (29/51)

"جو کتاب خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے، اور جو تمہارے پاس موجود ہے، کیا وہ کافی نہیں (جو تمہیں اس کے ساتھ اوروں کو بھی ملانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟)"

یاد رکھو۔ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ... (6/115)۔ خدا کی کتاب مکمل ہے۔ اس لئے اس کے احکام میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ غیر متبدل بھی ہے، اس لئے ان احکام میں تبدیلی بھی نہیں کی جا سکتی۔ جو حکومت اس کتاب کے مطابق قائم ہوگی وہ اسلامی کہلائے گی اور وہ اس کتاب کی اقدار، اصول، احکام و قوانین کو اپنے حالات کے مطابق نافذ کرنے کے طریق وضع کرے گی۔ یہی اس کا فریضہ ہوگا اور یہی اس کے اختیارات کے حدود۔

ہم مملکتِ پاکستان میں قانون سازی کا فریضہ ادا کرنے والوں کی خدمت میں ایک بار پھر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم بارگاہِ خداوندی میں بری الذمہ ہو سکیں کہ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ۔ (7/62) ہم نے پیغاماتِ خداوندی آپ حضرات تک پہنچا دیئے تھے۔ اور آپ بارگاہِ خداوندی میں یہ عذر پیش نہ کر سکیں۔ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ○ (7/172) ہمیں ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں تھا ——— فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اگر آپ آج اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تو ایک وقت آئے گا جب آپ ان باتوں کو یاد کریں گے۔ باقی رہے ہم ——— سو اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد ہم اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ○ (40/44)۔

تکملہ :-

یہ تبصرہ شروع ۱۹۸۱ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد (قانون سازی کے سلسلہ میں) پوزیشن مزید ابتر ہوتی گئی۔ وفاقی شرعی عدالت نے رجم کی سزا کو خلافِ اسلام قرار دیا تھا۔ حکومت نے اس عدالت میں تبدیلیاں کر کے اس سے کہا کہ وہ اس فیصلہ پہ نظرِ ثانی کرے۔ اس نے اس (سابقہ عدالت کے) فیصلہ کو منسوخ کر کے رجم کی سزا کو اسلامی قرار دے دیا (جو قرآن کے خلاف ہے)۔ قانونِ شہادت کا مسودہ مختلف مراحل طے کر کے اپنی آخری منزل میں پہنچ چکا ہے۔ اس میں بیشتر شقیں قرآن کے بھی خلاف ہیں اور ایسی بھی جن کی رُو سے بعض سنگین جرائم کا ثابت کیا جانا ناممکن ہو گا۔ اسی طرح قصاص اور دیت سے متعلق قوانین کا مسودہ بھی آخری مرحلہ میں پہنچ چکا ہے۔ ہم نے اس مسودہ پر طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۸۱ء میں تنقید کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس میں کس قدر شقیں قرآن کریم کے خلاف ہیں، اور اگر یہ قانون نافذ ہو گیا تو قتل کی وارداتیں کس قدر عام ہو جائیں گی۔ مختصراً یہ کہ خلافِ قرآن قوانین سازی کا پروگرام بدستور آگے بڑھ رہا ہے۔

ہمیں نہ کسی قانون ساز ادارہ کے خلاف تنقید مقصود ہے، نہ کسی عدالت کے فیصلوں پہ تبصرہ۔ ہم ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جب قیامت میں حضورؐ نبی اکرمؐ خدا سے شکایت کریں گے کہ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) بار الہا! یہ ہیں میری امت کے وہ افراد جنہوں نے تیری کتاب کو ترک کر دیا تھا۔ تو کیا آپ نے اس کا جواب سوچ رکھا ہے؟ یہ عذر کہ ہم نے فقہی قوانین نافذ کرائے تھے، تو بارگاہِ خداوندی میں قابلِ پذیرائی نہیں ہو گا۔ فقہ نہ کتاب اللہ ہے نہ اسے تائیدِ خداوندی حاصل ہے۔ قرآن کے مقابلہ میں اس کی حیثیت کیا ہے، اس کا اندازہ ان دو واقعات سے لگائیے۔ برصغیر ہند و پاک میں، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ (دیوبندی) اور مولانا انور شاہؒ (دیوبندی) فقہ حنفی کے اساتین میں سرفہرست تھے۔ مفتی محمد شفیع (مرحوم) راوی ہیں کہ شیخ الہند (مرحوم) نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک دفعہ فرمایا کہ "میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس سوال پہ غور کیا کہ مسلمان دنیا میں تباہ کیوں ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا۔ اور دوسرے آپس کے اختلافات۔ میں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ باقی زندگی قرآنی تعلیم کے عام کرنے میں صرف کروں گا۔" اور مولانا انور شاہ (علیہ رحمتہ) کے متعلق انہوں نے کہا کہ ایک صبح دیکھا کہ وہ سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ پوچھنے پہ فرمایا کہ سر پکڑے اس لئے بیٹھا ہوں کہ ساری عمر فقہی مسائل کے حل کرنے میں صرف کر دی اور دین کی ان اہم ضروریات کی طرف توجہ ہی نہ کی، جنہیں لے کر انبیاء کرامؑ آئے تھے۔ اس لئے عمر ضائع ہو گئی۔" (بحوالہ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۶ء)۔ یہ ہے اس فقہ کی حیثیت جسے آپ حضرات قرآن کے خلاف قوانین کا مدار قرار دے رہے ہیں! فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۴/۳) کیا ہے جو اس سے نصیحت پکڑے؟

اُردو زبان میں نماز

(پرویز)

پرویز صاحب کے خلاف جو جھوٹے الزامات تراشے جاتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اردو زبان میں نماز پڑھنے کو کہتے ہیں۔ ہم کتنی بار اس کی تردید کر چکے ہیں لیکن جن کا عقیدہ یہ ہو کہ "زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہوتا ہے" وہ ترکِ وجوب سے گناہ کے مرتکب کیسے ہو سکتے ہیں! اس لئے وہ اس الزام کو برابر دہرائے چلے جاتے ہیں۔ آج کل اشتہارات ان کی اس مہم میں تیزی آگئی ہے کیونکہ ہم سے استفسارات کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس بنا پر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس اعتراض کے جواب کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے۔

قصّہ یوں ہے کہ قریب پچیس چھبیس سال کی بات ہے، لاہور میں ایک صاحب نے تحریک چلائی کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جائے۔ پرویز صاحب اس زمانے میں کراچی میں تھے، انہوں نے اس خطرہ کو بھانپ کر اس کی تردید میں بڑے بڑے اشتہارات لاہور کی در و دیوار پر چسپاں کرائے اور پھر اس پر ایک مقالہ لکھا جو طلوعِ اسلام کی جون ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ اس کے بعد بھی شائع ہوا، اور اب بارِ دیگر درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ پرویز صاحب کے خلاف اس الزام کی حقیقت کیا ہے۔

قارئین سے مشورۃً درخواست ہے کہ جب کبھی پرویز صاحب یا طلوعِ اسلام کے خلاف کوئی صاحب کوئی الزام عائد کریں تو ان سے کہا کریں کہ وہ اس الزام کا ثبوت پیش کریں۔ اس سے بات وہیں ختم ہو جائیگی۔ اصولاً بارِ ثبوت الزام لگانے والے کے سر پر ہوتا ہے۔ اگر وہ کوئی ثبوت پیش کریں تو اس کی تصدیق یا تردید کے لئے بے شک ہماری طرف رجوع کر لیں۔ اس سے آپ کا اور ہمارا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ اور الزام تراشی کی مہم بھی ماند پڑ جائیگی۔

اب آپ پرویز صاحب کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کی بجائے) اردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آ جاتا ہے کہ کیا قرآن، عربی زبان کے بجائے اردو زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر، کیا قرآن کا ترجمہ (اردو یا کسی اور زبان میں، حتیٰ کہ خود عربی زبان کے اور الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟ اس سوال کا کھلا ہوا اور دوٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے اور ان الفاظ کی جگہ کوئی اور الفاظ خواہ وہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے۔ لیکن اس ضمن میں بعض گوشوں سے مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال ہے کہ خدا کی طرف

ایک غلط خیال

سے نبی اکرمؐ کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہوا تھا، الفاظ نہیں۔ چونکہ حضورؐ کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لئے آپؐ نے اس مفہوم کو اُن لوگوں کی زبان میں بیان فرما دیا۔ لہٰذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں، وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر لیں تو یہی قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصور جس کے ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نقطہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے، ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں، اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے۔ یعنی —— نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ بحث کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبویؐ پہ وحی ہوا تھا یا اس کے الفاظ بھی، ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ (مسئلۂ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں) بڑی شدید بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن ایک تو اس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی، دوسرے، جن لوگوں نے اب اس سوال کو اٹھایا ہے وہ قدامت پرست طبقہ سے متعلق نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق ہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان سے ان کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ ان کے سامنے حقیقت واضح طور پر آ جائے۔

وحی کا انکار

ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم خود نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات اور تصورات کا مجموعہ ہے، لیکن چونکہ آپؐ نابغہ (Genius) واقع ہوئے تھے اس لئے ایک ([illegible]) کی طرح آپؐ (معاذ اللہ) یہی سمجھتے تھے کہ —— آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں —— ان لوگوں سے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس قسم کا خیال، وحی اور قرآن کا کھلا ہوا انکار ہے، جس کے بعد کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ قرآن، خدا

کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے جس میں نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا کوئی دخل نہیں۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خدا کی طرف سے القاء ہوتے تھے لیکن ان خیالات کو حضورؐ بیان اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔

الفاظ اور خیالات کا باہمی تعلق

یہی وہ طبقہ ہے جو سرِدست ہمارا مخاطب ہے۔ انہیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے "ضرب کلیم" میں "جان و تن" کے عنوان کے تحت کہا ہے:۔

ارتباطِ حرف و معنی۔ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس شعر میں انہوں نے، نہایت مختصر اور مرتکز انداز سے، اس فلسفیانہ بحث کو سمو دیا ہے جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس سوال کو انہوں نے اپنے خطبات (خطبہ اوّل) میں بھی ضمنی طور پر چھیڑا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"مبہم اور بے زبان احساس ([illegible]) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیل ([illegible]) کی شکل اختیار کرتا ہے، اور تخیل اپنا لباس آپ بن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ، دونوں، احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم (کا نقص) ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر بک ([illegible]) اپنی مشہور کتاب ([illegible]) میں تصور ([illegible]) اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں لکھتا ہے"۔

"ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا ...... کوئی نیا لفظ معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جب تک وہ کسی تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو، اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آ جائے"۔ ([illegible])

پروفیسر ایرون ([illegible]) نے اپنی کتاب (HUMANITY & DEITY) میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وجدان ([illegible]) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروچے ([illegible]) کے حوالے سے لکھتا ہے کہ،

"الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے ...... یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شے

کا تصور کرے اور اس کے بعد اس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے۔ وہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ (صـــ ۵۳)

اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا (صـــ ۲۹۷)

اس سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ

جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ (صـــ ۶۵)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (POETRY) کو بطور مثال پیش کیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کر کے وہ بات پیدا ہی نہیں کر سکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کے منکرین کی یہ تحقیق، قرآن کے اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزل من اللہ کتاب ہے یعنی اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

عربی زبان کی وسعت

اوّل تو عربی زبان ہی ایسی وسیع، گہری اور جامع ہے کہ (ماہرین علم السنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی (حتیٰ کہ سائنٹیفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر بک کی جس کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے (یہ بحث اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میرے لغت قرآن میں آئے گی[1] جس سے یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت و حکومت کے لئے منتخب کیا تھا، دوسری طرف بنی اسرائیل کے ذمے اگویا یہ فریضہ عائد کر دیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (DEVELOP) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا، قرآن نازل ہوا اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہو سکتے ہیں؟ بدل ہونا تو ایک طرف۔

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے، چنانچہ پروفیسر گب (H. A. R. Gibb) اس باب میں لکھتے ہیں:

جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا، قرآن کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک

---

[1] لغات القرآن چار جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ (۱۹۸۴ء)

ملہم اپنے الہام کو عام زبان میں ادا کر ہی نہیں سکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح اکسی حسین وجمیل (تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے پیچ وخم اور اس کے رنگوں کے لطیف اور نازک فرق کا، ایک طویل مدت تک، نہایت غور وخوض سے مطالعہ کیا جائے۔ لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط والوان ہی کا نہیں۔ بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرتے ہیں، اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصل صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اڑنے والے ست ہین وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں! آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ، جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں، ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو۔ اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے۔ اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی وتفوقوں کو بھی لے آئے (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہو!) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگم سا اثر ہوگا۔ (مثلاً) قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے: إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ انگریزی کیا، دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔

(MODERN TRENDS IN ISLAM) P.4

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام! آپ سوچئے! کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں؟ اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن

ہمارے تراجم کا اثر

کے اپنے الفاظ، گو جیسے غیر مسلم کے دل میں اثر وجذب کا ایک محشر برپا کر دیتے ہیں لیکن جب ہم (مسلمان) اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے

ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے۔ اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ ق کی اسی آیت کو لیجئے جسے گب نے پیش کیا ہے۔ وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے وجد میں آرہا ہے۔ اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

تحقیق ہم جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گب نے جو ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے:۔

VERILY WE GIVE LIFE AND DEATH AND UNTO US IS THE JOURNEYING

اس قسم کے تراجم، مارماڈیوک پکتھل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل آیت سے گب کے دل پر ہوا ہے؟

اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے نخلِ طیب کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر میں نے "لغات القرآن" کے بعد جب "مفہوم القرآن" کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔[1] مفہوم بھی نہ تو کسی طرح اصل کا بدل ہو سکتا ہے۔ نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پا سکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائیگی تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سندِ دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ اس باب میں (مشہور مورخ) ڈاکٹر ٹوئن بی، اپنی کتاب (AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION) میں لکھتا ہے:۔

عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفۂ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں ..... اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانۂ مابعد کی سائنٹیفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں لہٰذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ اُن کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس، یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں زمان کی قید سے ماوراء تھیں۔ (ص ۱۲۹)

لہٰذا قرآن کا جو مفہوم بھی کسی ایک دور میں کیا جائے وہ وقتی ہو سکتا ہے ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے اپنے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ قرآن کا ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ، متن کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں) قرآن کی

---

[1] مفہوم القرآن بھی شائع ہو چکا ہے۔ (۱۹۸۴ء)

آیات آ جاتی ہیں۔ وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ وہ عربی زبان کے بھی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جا سکتے اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لئے کسی اور زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آج کل پڑھی جا رہی ہے اس میں لوگ (باستثنائے چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور انہیں بغیر سمجھے یونہی دہرائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے اس کی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں جن کا ہم مطلب سمجھ رہے ہوں؟

بلا سمجھے الفاظ کا دہرانا

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں وہ نماز بے مقصد اور بے روح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے روکا ہے۔ سورہ نساء میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴/۴۳) اے ایمان والو! تم جب نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ۔ جب تک تم یہ نہ جانو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس آیت میں حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ سے اس حکم کی علت غائی سامنے آ جاتی ہے۔ یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پر نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اس کا علم نہ رکھے۔ یا جہالت کی بنا پر ایسا ہو۔ تو حکم دونوں کا ایک ہی ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے ان کے دہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا[1] لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے تو پھر ان الفاظ کی جگہ اردو کے الفاظ کیوں نہ بولیں؟ ایسا کہنے کے معنی یہ ہیں کہ دردِ سر کا علاج سر کا کاٹ ڈالنا ہے۔

سر درد کا علاج

سر درد کا علاج، سر کا کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اس علت کا ازالہ ہے جو سر درد کا موجب ہے۔ یعنی اس جہالت کا دور کرنا جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معانی نہیں سمجھے جاتے۔ بنا بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ (۱) ہم حکومت پر زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو[2]

---

[1] میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بے سمجھے بوجھے دہرانا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

[2] قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہو گی۔ لیکن آغازِ کار کے لئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اٹھ جائے گا۔

۲۔ ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔
۳۔ ثانوی سے آخر تک، عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔
اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آ جائے گا۔

عربی، اردو نماز

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً:

۱۔ اس وقت، نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ باجماعت نمازیں بھی، فرضوں کے سوا، باقی نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کر لیں گے کہ امام کی عربی قرآت کے ساتھ اردو کے الفاظ بولتے جائیں لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہو گی؟

۲۔ نیز جن نمازوں میں یا فرضوں کی جن رکعتوں میں قرآت بلند آواز سے نہیں ہوتی، ان میں اردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا؟ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہو گی؟ کیا ایسا ہو گا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اُردو ترجمہ پکار کر کہے؟

۳۔ یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے امّت میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ ایسا جرم ہو گا

نئی نماز

جو ان تمام (مزعومہ) فوائد کو لے ڈوبے گا جن کے پیشِ نظر آپ اس جدّت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ اور شرک جرمِ عظیم۔ ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے۔ اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر کس قدر متشدّد ہوتا ہے: اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے، تو خود اس فرقہ کا وجود معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے وہیں اس سے بچنے کے لئے "وحدتِ صلوٰۃ" کا ذکر کر دیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے ... وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲)

تم صلوٰۃ قائم کرو۔ اور (مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ، یعنی ان میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

میرا مسلک

یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ) اس کی شدت سے تلقین کرتا چلا آرہا ہوں کہ اس وقت جس جس طریق سے نماز پڑھی جارہی ہے اس میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم کے ردوبدل سے، مختلف فرقوں کی نماز میں وحدت تو پیدا ہو نہیں سکے گی۔ البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔[1] وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ امّت لازم و ملزوم ہیں۔ اور وحدتِ امّت، صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک امّت میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا، نماز میں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، امت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے اور تفرقہ پیدا کرنا قرآن کی رُو سے سنگین جرم ہے۔ لہٰذا جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نماز اردو یا اردو، عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں وہ دین یا امّت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے الٹا اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امّت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ ہے اس تحریک کا خطرناک پہلو۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی قوم کی جہالت دور کرنے اور اسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات:۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

---

[1] آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس تلقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے!

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

(۱) بعض اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائیگا۔

(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

فتنۂ انکارِ سُنّت

تشکیل پاکستان کے بعد ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ایک اصطلاح وضع ہوئی ــــ فتنۂ انکارِ سنت ــــ جس کے ہدف پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام قرار پائے چونکہ ان حضرات کے ہاں پراپیگنڈہ کی نہایت وسیع اور مؤثر مشینری ہر وقت موجود رہتی ہے (ہر مسجد ان کا ریڈیو سٹیشن ہوتا ہے) اس لئے انہوں نے اس افتراء کو اس شدت سے پھیلایا کہ یہ زبان زدِ خلائق ہو گیا۔ اسی زمانے سے طلوعِ اسلام میں اس الزام کی تردید میں مسلسل لکھا گیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بعض احباب کی طرف سے یہ تقاضا موصول ہو رہا ہے کہ طول طویل مقالات کے بجائے مختصر اور عام فہم الفاظ میں یہ بتایا جائے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے اور ان حضرات کی طرف سے اس کا اس شد و مد سے پراپیگنڈہ کیوں کیا جاتا ہے۔ ذیل کی سطور کا مقصد اسی تقاضا کو پورا کرنا ہے۔

---

(۱) تشکیل پاکستان کے بعد ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے، اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ اس مطالبہ کے پیش کرنے والے بیشتر حضرات وہ تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران مطالبۂ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی۔

(۲) اربابِ حل و عقد کی طرف سے ان سے کہا گیا کہ آپ میں اتنے فرقے موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں کوئی ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کیا جا سکے گا جسے آپ سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کیا جا سکے۔

(۳) اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے (۱۹۵۱ء میں) مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل (جن کی تعداد اکتیس تھی) ایک کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ شخصی قوانین (پرسنل لاز) تو ہر فرقے کے اپنے ہوں، اور پبلک لاز "کتاب و سنت" کے مطابق وضع کئے جائیں۔ اس مطالبہ کو پیش کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ "دیکھ لیجئے! فرقہ وارانہ اختلافات کا جو عذر آپ لوگ پیش کرتے تھے، وہ باقی نہیں رہا۔ اس مطالبہ پر تمام فرقوں کے نمائندگان متفق ہیں۔ اب اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہئیے"۔

(۴) اس پر ہم نے کہا کہ آپ حضرات کا یہ اتفاق محض "کتاب و سنّت" کے الفاظ پر ہے۔ ان کے عملی مفہوم میں آپ کے فرقہ وارانہ اختلافات اس کے بعد بھی بدستور باقی رہیں گے اس لئے کہ "سنّت" ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔ اس کے لئے کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود دیکھئے:

(i) نماز کی تفصیلات، سنّت کی رُو سے طے پاتی ہیں۔ اور ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے۔ اگر سنّت کے عملی مفہوم میں سب فرقے متفق ہیں تو پھر سب کی نماز ایک جیسی کیوں نہیں؟

(ii) شخصی قوانین کا مدار سنّت پر ہے۔ یعنی ہر فرقہ اپنے قوانین کی تائید میں سنّت کی سند پیش کرتا ہے۔ اگر آپ حضرات کی سنّت متفق علیہ ہے تو یہ قوانین یکساں کیوں نہیں؟ آپ کا اصرار کہ شخصی قوانین ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے اس امر کی بدیہی شہادت ہے کہ ہر فرقے کی الگ الگ سنّت ہے۔ اگر سنّت کی رُو سے شخصی قوانین کا متفق علیہ ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا تو پبلک لاز کا متفق علیہ ضابطہ کسطرح مرتب ہو سکے گا؟

(iii) اگر آپ حضرات اپنے اس مطالبہ میں فی الواقعہ مخلص ہیں، تو کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ سب مل کر سنّت کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کریں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو، اور اس میں کوئی سنّت (حدیث) قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ پبلک لاز کا ایسا ضابطہ مدوّن ہو سکے جو "کتاب و سنّت" کے مطابق ہو۔ جب تک ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہوتا، کتاب و سنّت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی متفق علیہ ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

(۵) اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سنّت کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا جو سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اگر یہ حضرات ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کے مطالبہ میں مخلص ہوتے تو یا تو یہ سنّت کا متفق علیہ مجموعہ مرتب کرتے، اور یا نہایت دیانتداری سے اعتراف کر لیتے کہ ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد اپنے اس مطالبہ سے بھی دستکش ہو جاتے کہ ملک کے قوانین کتاب و سنّت کے مطابق ہونے چاہئیں۔

(۶) طلوعِ اسلام نے ان سے کہا کہ جب آپ حضرات سنّت کا متفق علیہ مجموعہ مرتب نہیں کر سکتے تو پھر مطالبہ یہ کیجئے کہ ملک کے قوانین کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق ہونے چاہئیں کیونکہ قرآن کریم سب فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔

(۷) ایسا تسلیم کرنے سے فرقوں کا وجود ختم ہو جاتا تھا، اور فرقوں کا وجود ختم ہو جانے سے خود ان کی الگ الگ حیثیت بھی ختم ہو جاتی تھی۔ یہ اس پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے؟

(۸) ان حقائق کی روشنی میں، یہ حضرات جس مشکل میں پھنس گئے تھے، اس کا انہوں نے ایک ہی حل سوچا۔ اور وہ یہ کہ عوام کو جذبات میں الجھا دیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ الزام تراشا کہ طلوعِ اسلام، منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ رسالتؐ ہے۔ منکرِ سنّت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی

(بدنصیب) کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ وہ منکرِ شانِ رسالتؐ ہے، تو وہ کون سا مسلمان ہے جو اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا کرے گا؟

(۹) یہ ہے وہ حربہ جو ان حضرات نے، اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے، وضع اور استعمال کیا۔ اور یہ ہے وہ پراپیگنڈا جو تیس پینتیس سال سے مسلسل پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کے خلاف جاری ہے۔ ہماری قوم جذباتی واقع ہوئی ہے، اس لئے وہ پراپیگنڈہ کا بہت جلد شکار ہو جاتی ہے اور یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتی کہ اصل بات کیا ہے؟ "منکرینِ سنت" کے ساتھ اس قسم کے بے بنیاد الزامات بھی تراشے گئے کہ یہ تین نمازوں اور روزوں کے بدلے روزوں کی تلقین کرتے ہیں، اردو میں نماز پڑھنے کو کہتے ہیں۔ آپ اس کی لاکھ تردید کیجئے۔ ان کا پراپیگنڈہ سچی آواز کو ابھرنے ہی نہیں دیتا۔

(۱۰) طلوعِ اسلام اپنی بات پر اس لئے جم کر کھڑا ہے کہ

(۱) ایک تو وہ بات سچی ہے اور قرآن کریم پر مبنی (۲) دوسرے، اس کی دلی آرزو (بلکہ اس کے ایمان کا تقاضا) ہے کہ مملکتِ پاکستان، اسلامی مملکت بن جائے۔ وہ جانتا ہے کہ مذہب پرست طبقہ کے اس مطالبہ کی رُو سے (کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہونے چاہئیں) نہ اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں، نہ یہ مملکت اسلامی بن سکتی ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ اگر ایسا ہوا تو (نہ صرف یہ کہ جس مقصد کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، وہ مقصد حاصل نہیں ہوگا) اسلام دنیا میں بدنام ہو جائیگا کہ اس میں اب آگے چلنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ مملکت کے اسلامی نہ ہونے سے ان حضرات کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہاں سیکولر نظام نافذ ہو گیا تو ان کے فرقے بھی بدستور باقی رہیں گے اور شخصی قوانین بھی، جن پر ان کی اجارہ داری ہے۔ ان کے بھائی بند (بلکہ اساتذہ اور پیرومرشد) اسی اسلام پر مطمئن ہیں جو بھارت میں رائج ہے۔ یہی کیفیت ان کی ہوگی۔ یہ مطالبۂ پاکستان کی مخالفت یہی کہہ کر کیا کرتے تھے کہ جب ہندو، اسلام کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے تو پھر ایک الگ مملکت کی ضرورت کیا ہے؟

(۱۱) سُنت کا متفق علیہ مجموعہ مرتب ہونا تو ایک طرف رہا، ان میں یہ بحث چھڑ گئی کہ "سنت" کہتے کسے ہیں؟ ایک طرف سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) تھے اور دوسری طرف جماعت اہلِ حدیث کے سابقہ امیر، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ (مرحوم)۔ یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے سنہ ۱۹۵۱ء کی متفق علیہ قرارداد پر دستخط کئے تھے۔ یعنی ان کا متفق علیہ مطالبہ یہ تھا کہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہونے چاہئیں، اور عملاً کیفیت یہ کہ اس امر پر بھی اتفاق نہیں تھا کہ سنت کہتے کسے ہیں! یہ بحث مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ ——— جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث ——— میں موجود ہے۔ بحث تکفیر تک منتج ہو کر ختم ہوئی تھی۔

(۱۲) بیس سال تک کتاب و سنت کے مطابق قوانین سازی کا مطالبہ اور طلوعِ اسلام کے خلاف انکارِ

حدیث و سنت کا پراپیگنڈہ جاری رہا لیکن قانون سازی کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا کیونکہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) یہ ممکن تھا ہی نہیں۔ بیس برس کے بعد بالآخر مودودی (مرحوم) کو ـــــ جو اس مطالبہ کے میر کارواں تھے ـــــ اعلان کرنا پڑا کہ،

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

بیس سال پہلے پرویز صاحب نے یہی بات کہی تھی تو ان پہ کفر کے فتوے لگ گئے تھے لیکن مودودی صاحب نے وہی بات کہی تو کسی گوشے سے تکفیر تو ایک طرف، تردید تک کی آواز بھی نہ اٹھی۔ یہ اس لئے کہ مودودی (مرحوم) "مولانا" تھے۔

(۱۳) آپ کے دل میں شاید یہ خیال ابھرا ہوگا کہ اس کے بعد مودودی (مرحوم) نے یہ کہا ہوگا: ضابطۂ قوانین کتاب اللہ کے مطابق مرتب کیا جائے کیونکہ وہ سب کے نزدیک متفق علیہ اور ارشادِ خداوندی کی رو سے کفر اور اسلام کے لئے معیار ہے۔ لیکن توبہ کیجئے! وہ قرآن کا نام کیسے لے سکتے تھے! اس سے ان کے اقامتِ دین کے دعاوی ڈھیر ہو کر رہ جاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے اور اس کے لئے دلیل یہ دی کہ ملک کی اکثریت حنفی ہے۔

لیجئے! اب نہ کتاب باقی رہی نہ سنت۔

(۱۴) مودودی (مرحوم) نے اس فقہ کے نافذ کرنے کی تجویز پیش کی تھی جس کے متعلق ان کے اپنے نظریات یہ تھے،

(ا) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم پانچواں ایڈیشن۔ صفحہ ۲۲۶)

(ii) یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پہ ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے (ایضاً صفحہ ۱۲۶)

(iii) دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم۔ ۱۳۵۶ھ)

(iv) میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم صفحہ ۱۹۰)

(v) میں نہ مسلک اہل حدیث کو، اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ، صحیح سمجھتا ہوں، اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۳۵)

(vi) میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر

چیز ہے۔ (ایضاً صـ۲۴۴)

(۱۴) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات صـ۱۲)

(۱۵) یہ تھی خود مودودی (مرحوم) کے نزدیک وہ فقہ جسے انہوں نے پاکستان میں اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

(۱۶) "کتاب وسنّت" کے خلاف مودودی (مرحوم) کی دلیل یہ تھی کہ مختلف فرقے اس پر متفق نہیں ہو سکیں گے۔ جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے،

(ا) شیعہ حضرات کی اپنی فقہ ہے، وہ کسی دوسری فقہ کو اسلامی تسلیم نہیں کرتے۔

(ii) سنیوں میں اہلحدیث حضرات فقہ کے قائل ہی نہیں۔ حنفیوں کے ساتھ ان کے جھگڑوں کی شہادت ہر مسجد دیتی ہے۔

(iii) پاکستان میں حنفیوں کے دو فرقے ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نماز تک نہیں پڑھتے۔

(iv) اس فقہ کو جب مملکت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا جائیگا تو اس سے جو فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوں گے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے حکومت نے ابھی تک زکوٰۃ (اور عشر) کو پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کیا ہے۔ اس کے نفاذ کے چند دنوں کے اندر، شیعہ حضرات نے عملی احتجاج سے، اسے بدلوا دیا۔ اور اس کے بعد حکومت کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ ہر فرقہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق اس پر عمل کرے۔ یعنی سب سے پہلا اسلامی پبلک لاء، پرسنل لاء میں تبدیل کرنا پڑا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

علاوہ ازیں فقہی قوانین ہزار سال پہلے مدوّن ہوئے تھے وہ آج ناممکن العمل ہو چکے ہیں چنانچہ حدود سے متعلق آرڈیننس کے ضمن میں خود صدرِ مملکت کو اعتراف کرنا پڑا کہ ان کے مطابق سزا نہیں دی جاسکتی۔ اس کا نتیجہ یہ کہ عملاً انگریز کے زمانے کے سیکولر لاز ہی نافذ ہیں۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں کتاب وسنّت کے مطابق قانون سازی کی اب تک کی تاریخ۔

(۱۷) کسی مملکت کے جداگانہ تشخص کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تمام باشندگانِ مملکت واحد ضابطۂ قوانین کے تابع ہوں۔ اس وقت ہماری مملکت کا تشخص اس لئے قائم ہے کہ اس میں بہ حیثیتِ مجموعی انگریزوں کے زمانے کا سیکولر قانون رائج ہے۔ اس سے اس کی وحدت قائم ہے۔ جب یہاں ہمارے مذہبی طبقہ کے نظریہ کے مطابق ——— "اسلامی قانون" نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو مملکت کی موجودہ وحدت بھی ختم ہو جائیگی، اس لئے کہ ———

(i) کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین بن نہیں سکے گا اور
(ii) فقہی قوانین کو مختلف فرقے تسلیم نہیں کریں گے۔
اس سے ملک کی جو حالت ہو گی، ظاہر ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس خطرہ کو نہ ارباب دانش و بینش محسوس کرتے ہیں، نہ اعیانِ حل و عقد۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس مسئلہ کو سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لے ہی نہیں رہا۔ اس کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ قانون کا معیار خدا کی کتاب کو قرار دیا جائے۔ لیکن اس کے لئے بڑی جرأت ایمانی کی ضرورت ہو گی جس کا بہ حالاتِ موجودہ بہت کم امکان نظر آتا ہے۔ اس لئے جو کچھ خدا دکھائے وہ لاچار دیکھنا۔
یہ ہے اس فتنۂ انکارِ سنت کی حقیقت جس سے طلوعِ اسلام کو مطعون کیا جاتا ہے۔

جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن کی حیثیت قانونی نہیں۔ تو ہمارے احادیث کے مجموعوں میں صحیح روایات بھی ہیں اور ضعیف بھی۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو روایت قرآن کریم کے مطابق ہو، اسے ہم صحیح سمجھتے ہیں۔ جو اس کے خلاف ہو، اس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہؐ کی حدیث ہو نہیں سکتی۔ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں یعنی ہم رسول اللہؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتے۔ ایسی روایات کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ رسول اللہؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔
باقی رہے نماز، روزہ وغیرہ ارکان۔ سو انہیں جس طرح مختلف فرقے ادا کرتے ہیں، کرتے رہنا چاہیئے۔ ان میں سے ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کی ادائیگی سنت کے مطابق کرتے ہیں، اور اب کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے حتمی طور پر معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کون سا طریق حضورؐ کے عمل کے مطابق ہے۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرنا چاہیئے، نہ ہی کوئی نیا طریق وضع کرنا چاہیئے۔ ہم خود اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اگر کبھی اسلامی مملکت قائم ہوئی تو وہ امت کے لئے متفق علیہ طریق طے کرے گی کیونکہ اس وقت "عبادات" شخصی قوانین اور پبلک لاز میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔ ان سب کے متعلق مملکت کا فیصلہ، قولِ فیصل ہو گا۔

یہ ہے سنت (اور احادیث) کے متعلق ہمارا مسلک۔ یہ فیصلہ آپ خود کر لیجئے کہ یہ سنت کا انکار ہے یا حقیقت کا اظہار۔
ہماری، آپ سے، درخواست ہے کہ جب کوئی شخص ہمارے خلاف انکارِ سنت کا الزام عائد کرے تو آپ اس سے اتنا پوچھیے کہ:۔

(۲) کیا آپ کسی ایسی کتاب کا نام لے سکتے ہیں جس میں درج شدہ سنّت کو تمام فرقے سُنّت تسلیم کرتے ہوں۔

(۳) حنفی جس طریق سے نماز پڑھتے ہیں اور اسے اتباعِ سنّت قرار دیتے ہیں، اہلِ حدیث حضرات اس کی یہ کہکر مخالفت کرتے ہیں کہ وہ مطابق سنّت نہیں۔ ایسا ہی حنفی حضرات، اہلحدیث کے متعلق کہتے ہیں۔ کیا سنتِ رسول اللہؐ ایسی ہی ہے کہ ایک فرقے کی سنّت دوسرے فرقے کی سنّت سے ملتی نہیں۔ کیا اس طرح ہر فرقہ، دوسرے فرقے کی سنّت سے انکار نہیں کرتا؟

(۴) کیا اہلحدیث حضرات، فقہ حنفی کو مطابق سنّت تسلیم کرتے ہیں؟

(۵) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے جب کہا کہ کتاب وسنّت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی متفق علیہ مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ (اور دیگر فرقوں میں سے کسی نے اس کی تردید نہ کی) تو کیا یہ انکارِ سُنّت نہیں؟ اگر یہ انکارِ سُنّت ہے تو آپ نے کبھی اُنہیں بھی منکرِ سُنّت قرار دیکر ان پر کفر کا فتویٰ عائد کیا ہے؟ اور اگر ایسا کہنا سنّت (یعنی اطاعتِ رسولؐ) سے انکار نہیں، تو پھر طلوعِ اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کیوں کیا جاتا ہے؟ وہ بھی تو یہی کہتا ہے۔

(۶) پرسنل لاز کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا ہے (اور اسے دستورِ پاکستان میں بھی شامل کر لیا گیا ہے) کہ یہ ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے، تو (بالفاظِ دیگر) کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ "کتاب وسنّت" کی رُو سے پرسنل لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جاسکتا جو سب کے نزدیک اسلامی قرار پا سکے۔ جب پرسنل لاز کے متعلق صورت یہ ہے تو کیا اسے باور کیا جاسکتا ہے کہ کتاب وسنّت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب کیا جاسکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں؟

(۷) کیا آپ کوئی ایسا طریق بتائیں گے جس کی رُو سے مرتب کردہ ضابطۂ قوانین کو تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر اسلامی شریعت۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی نظام وغیرہ الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کا جرم فقط اتنا ہے کہ وہ ان حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرتا، بلکہ انہیں پوری جراُت کے ساتھ واضح الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو یہ اقبالِ جُرم کرتا ہے۔

؎ وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی!

اقبالؒ کا پاکستان

پاکستان کا تصوّر، فکرِ اقبالؒ کی تخلیق ہے۔ لیکن اس کا جذبۂ محرکہ کوئی ہنگامی واقعہ یا سیاسی مصلحت نہیں تھی۔ یہ ان کے مدت العمر کے تدبّرِ قرآن کا ماحصل تھا۔ انہوں نے (سن ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد کے سوا) اس باب میں مربوط طور پر کچھ قلمبند نہیں فرمایا۔ لیکن ان کے کلام، بیانات اور خطوط میں، جستہ جستہ بہت کچھ موجود ہے۔ ہم ذیل میں ان بکھرے ہوئے موتیوں میں سے بعض کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض اقتباسات اس سے پیشتر قارئین کے سامنے آ چکے ہیں لیکن یہ حقائق ایسے ہیں کہ جتنی بار سامنے آئیں، نگاہوں میں جلا پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ خود علامہؒ کے الفاظ میں۔ ۔ ۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔

قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں!

عرشی صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے" انہوں نے فرمایا "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آ چکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشاء دریافت کرنے کے لیئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" (البیان۔ دسمبر ۱۹۲۹ء)

مقامِ حدیث

احادیث کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے، کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی

تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا جیسے بھی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رو سے رسولؐ کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے "تقاضوں" کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار احادیث پر کیوں نہیں رکھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہ طریقِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طریقِ عمل امام حنیفہؒ کے طریقِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبال صفحہ ۱۶۳-۱۶۴)

احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے،

مجھ کو ان[1] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں، اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کرکے ان کو الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لئے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضیکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعۃ القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخرالذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروّج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی

---

[1] خواجہ احمد الدین (مرحوم)

کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران، افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز، فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ دقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ در اصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوع کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ در اصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے: تعالوا الیٰ

کلمتِ سواء بیننا و بینکم۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب — متعلقہ "فلسفہ سنت کوشی")

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اوّل یہ کہ اگر عالم بشریت کا مقصد، اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخِ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستورالعمل قوم اور نسل پر بنا نہیں کیا جاسکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جاسکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ رہ کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرفِ انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسا اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصوّر میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے۔ اُن کے اساس انتخاب کا؟ لوتھر کی اصلاح، غیر سلیم اقلیت کا دور، اصولِ دین کا سٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں؟ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف! (حسین احمد مدنی کے جواب میں — مضمون متعلقہ وطنیت)

عالمگیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے	مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے

متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعرا اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولیں نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب — متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید، ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب — متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس

سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض جذباتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق محض صاحب واردات کے اندرونِ ذات سے ہو۔ لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبہ صدارت مسلم لیگ سنہ ۱۹۳۰ء)

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاستِ اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں، بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جز کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔ (بجواب حسین احمد مدنی — منتقلہ توضیحات)

امتِ مسلمہ جس دینِ فطرت کی حامل ہے اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی متقوم ہے، اس گروہ کے امورِ معاشی اور معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظِ دیگر یہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پہ قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پہ صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (ایضاً)

اسلام ایک طرح کی سوشلزم ہے

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور ان شاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی "تاریخ" سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے، جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔ (مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

یہی اسلام کی منزّہ شکل ہے

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہو گا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے، یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پہ میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفہ الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں، امراء کے بیٹوں کے حصہ میں آ جائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔ (عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہو گا۔ یہ تو رہا ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گذشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہو۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش (SUBSISTANCE) ضرور مل جاتا ہے (ہندوؤں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں) اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب اندازسے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں۔ اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزّہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا وہ شروع میں تھا۔

(مکتوب بنام قائداعظم محمد علی جناحؒ۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

اشتراکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گِل است

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تند بادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ امتاں — نفی بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے اِلّا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
اے کہ می بینی نیرزد با دو جو — از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو

هر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

الارض لِلّٰہ

حق زمین را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ الارض للّٰہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندہ مومن امینِ حق مالک است — غیرِ حق ہر شئے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو — چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد — من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکارِ خود نبرد — اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
بردہ چیزے کہ از آنِ تو نیست — داغم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گر تو باشی صاحبِ شئے می سزد — ور نباشی، خود بگو کے می سزد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست — آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست
اے کہ منزل را نمی دانی ز رہ — قیمتِ ہر شئے ز اندازِ نگہ

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مثالی معاشرہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش   خوب روئے نرم خوئے سادہ پوش
فکرِ شاں بے دردِ سوزِ اکتساب   راز دانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر   کار ہا ما کس نہ سنجد بہ زر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست   ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست
سخت کشِ دہقاں، چراغش روشن است   از نہیب دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجو ست   حاصلش بے شرکتِ غیرے از وست
اندراں عالم نہ لشکر نے قشون   نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرزِ ایں گیرد فروغ   از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ
نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش   نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

کس درین جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

حاصلِ مملکتِ اسلامیہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

ابلیس کی زبان سے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں   ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں   بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف   ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر   حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے   نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف   منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب   یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(ابلیس اپنی اس کوشش میں اب تک کامیاب ہے)

ایک کمیونسٹ نوجوان سے

کچھ عرصہ ہوا ایک نوجوان طالب علم ملنے کے لئے آیا۔ اس نے کہا کہ ایک کمیونسٹ اکثر اس قسم کے خیالات پھیلاتا رہتا ہے کہ "خدا کا تصور افیون ہے جسے سرمایہ دار طبقے نے اس لئے وضع کر رکھا ہے کہ غریبوں کو اس فریب میں مبتلا رکھا جائے کہ غریبی اور امیری خدا کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے تونگر بنا دے۔ جسے چاہے محتاج کر دے، اس میں کسی کا کچھ اختیار نہیں۔ اس سے سرمایہ داروں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غریبوں کا خیال تک بھی کبھی اس طرف نہ آنے پائے کہ ان کی محتاجی اور غریبی کا موجب سرمایہ دار طبقہ ہے، اور وہ اس طرح مطمئن ہو کر غریبوں کا خون چوستے رہیں۔" اس نوجوان نے کہا کہ اس قسم کے خیالات عام طور پر طالب علموں میں پھیلائے جاتے ہیں اور چونکہ انہیں مذہب کے متعلق کچھ معلومات نہیں ہوتیں، اور سطحی طور پر کمیونسٹوں کے یہ دلائل جی کو لگنے والے ہوتے ہیں، اس لئے یہ زہر سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا جواب ضرور دینا چاہیئے۔

طلوعِ اسلام

ہم اس کے جواب میں کمیونسٹ نوجوان کو براہِ راست مخاطب کرتے ہیں۔

ہمارے عزیز! یہ خیال کہ مذہب (یا خدا کا تصور) ایک افیون ہے جس سے غریبوں کو غریبی کے نشے میں مست رکھا جاتا ہے، مارکس کا پیدا کردہ ہے۔ مقصد اس سے وہی ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی اس سے غریبوں کو اس فریب میں رکھا جاتا ہے کہ تمہاری یہ حالت (اور امیروں کی امیری) خدا کی طرف سے ہے۔ نہ وہ اپنی امارت کی حالت کو غریبی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ نہ تم اپنی غریبی کو امیری میں بدل سکتے ہو۔ تم مجبور ہو، اس لئے تم اپنی حالت پر شاکر و صابر رہو۔ یعنی اس تصور میں قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ اس سے انسان کو مجبور بنا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس کا خیال تک بھی دل میں نہ لائے۔

قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ اسلام کی اس باب میں کیا تعلیم ہے ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود مارکسزم کی رُو سے اس ضمن میں حقیقی پوزیشن کیا ہے۔ یعنی مارکسزم کے فلسفہ کی رو سے انسان مجبور ہے یا صاحبِ اختیار و ارادہ! مارکسزم کے فلسفہ کی بنیاد مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) پر ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے جو بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنی انتہا تک جا پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک ایسا نظام نکلتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس سے وہ پہلا نظام ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ نیا نظام لے لیتا ہے۔ پھر اس نظام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ان دیکھی قوت کے زور پر ہوتا ہے جسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ پہلے غلامی کا دور تھا۔ پھر جاگیرداری کا نظام آیا۔ اس کے بعد کارخانہ داری شروع ہوئی۔ یہ سب نظام سرمایہ داری کے مختلف پہلو تھے۔ اب اسی جدلیت کے مطابق نظامِ سرمایہ داری کے خاتمہ کا وقت آ پہنچا ہے۔ اس کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہوگا۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے

جس کا رُخ کوئی نہیں موڑ سکتا۔ ساری دنیا کے سرمایہ دار مل کر کوشش کر کے دیکھ لیں۔ تاریخی وجوب کی بے پناہ قوت کے سامنے ان کی کوئی پیش نہیں جا سکے گی۔

یہ ہے مارکسزم کا فلسفہ۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا اس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور قرار پاتا ہے یا صاحبِ اختیار و ارادہ ٹھہرتا ہے؟ دنیا میں دو چار ہزار سال سے نظامِ سرمایہ داری قائم تھا۔ یہ نظام قائم تھا تاریخی وجوب کی بے پناہ قوت کے بل بوتے پر جس کا مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھا۔ اگر اس زمانے میں ساری دنیا کے سارے غریب مل کر بھی چاہتے کہ اس نظام کو الٹ دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ تاریخی وجوب ان کے دانت توڑ کر رکھ دیتی۔ لہٰذا، غریب اور کمزور اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ وہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اُس وقت نظامِ سرمایہ داری کے الٹنے کی خواہش یا کوشش کرتے تو کوئی مارکس شخص اٹھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور ان سے کہتا کہ تمہاری کیوں عقل ماری گئی ہے جو تاریخی وجوب سے ٹکر لینے کی ٹھان رہے ہو! تم اسے الٹ نہیں سکتے جب تک تاریخی وجوب، موجودہ دور کے خاتمہ کے بعد اسے الٹ نہ دے۔ تمہیں اس حالت میں زندگی بسر کرنا ہوگی۔ تم اس باب میں مجبور ہو۔ تمہاری اس تباہی کا ذمہ دار سرمایہ دار طبقہ نہیں۔ وہ بیچارے تو خود تاریخی وجوب کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ نہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے سرمایہ دار ہیں۔ نہ تم اپنے اختیار و ارادہ سے غریب اور مزدور ہو۔ حتیٰ کہ اگر وہ چاہیں بھی کہ تم پر کم کھا کر تمہاری حالت کو بدل دیں تو وہ پھر بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ کوشش تاریخی وجوب کے تقاضے کے خلاف ہوگی جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

فرمایئے عزیزم! جس اعتراض کی بناء پر آپ خدا کے تصور کو افیون قرار دیتے ہیں کیا مارکسزم کا فلسفہ بعینہٖ وہی نتائج نہیں پیدا کرتا؟ اس صورت میں کیا مارکسزم کا فلسفہ بھی افیون نہیں جو انسان کو یہ بتاتا ہے کہ تم تاریخی وجوب کے ہاتھوں مجبور ہو، اس لئے تم اپنی حالت کے بدلنے کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ۔

اس فلسفہ کی رُو سے جو اور نتائج مرتب ہوتے ہیں ذرا انہیں بھی ذہن میں رکھیئے۔ آپ کہتے ہیں کہ تاریخی وجوب کی رُو سے نظامِ سرمایہ داری کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اب اس کی جگہ دوسرا نظام قائم ہوگا۔ اگر سرمایہ دار طبقہ کہے کہ تم غلط کہتے ہو کہ اس نظام کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس کا دور ابھی کچھ عرصہ تک اور باقی رہے گا۔ تو آپ کے پاس ان کے اس دعوے کی تردید کی کیا دلیل ہے؟ آپ کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی وجوب کی رُو سے پہلے نظام کی مدت ختم ہو چکی ہے؟ نہیں! اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ آپ کے پاس خود تاریخی وجوب کے وجود کا ثبوت کیا ہے؟ کیا آپ اس پر محض اس لئے ایمان نہیں لا رہے کہ مارکس نے ایسا کہہ دیا ہے؟ کیا آپ اسے عقیدۃً نہیں مان رہے؟ اگر صورت یہی ہے تو پھر حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ آپ نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے جس کا خدا (معاذ اللہ) تاریخی وجوب ہے۔ جس کا پیغمبر (بزعمِ خود) مارکس ہے اور جس کا کلمہ مادی جدلیت ہے؟ اور جس میں انسان بیچارا اس "نئے خدا" (تاریخی وجوب) کے ہاتھ میں مجبور و مقہور ہے۔

دوسرے یہ کہ جب تاریخی وجوب کا یہ فیصلہ ہے کہ اب نظامِ سرمایہ داری ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ مزدوروں کا نظام مسلط ہو جائے گا تو آپ اس جدید نظام کے قیام کے لئے اس قدر ہاتھ پاؤں کیوں مار رہے ہیں؟ آپ مزدوروں سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ آپس میں متحد ہو کر نظامِ کہن کی بساط الٹ دو۔ آپ کیوں ہر جگہ فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں؟ آپ کیوں ایٹم بم کی دہشت سے نظامِ سرمایہ داری کو تباہ کرنے کی سوچ رہے ہیں؟ کیا تاریخی وجوب میں اس کی قوت نہیں کہ وہ از خود اس فرسودہ نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ اشتراکیت کا نظام قائم کر دے؟ اگر یہ انقلاب آ کر رہتا ہے اور یہ

دنیا کی متحدہ قوت بھی اسے روک نہیں سکتی تو آپ اس قدر مضطرب و بیقرار کیوں ہیں؟

اس کے بعد یہ سوچئے کہ آپ نظامِ سرمایہ داری کو انسانیت کے لئے زہرِ قاتل قرار دے کر اس کی ہزار برائیاں بیان کرتے ہیں۔ (یہ سب ٹھیک ہے) لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ نظام بھی تاریخی وجوب ہی کا قائم کردہ تھا تو پھر آپ اس پر اعتراض کس طرح کر سکتے ہیں؟ اور اس کے بعد اس پر بھی غور کیجئے کہ جب اشتراکی نظام کا دور ختم ہو جانے کے بعد، جدلیت کے اٹل چکر کی بنا پر، پھر (اس نظام کی ضد) نظامِ سرمایہ داری کا زمانہ آ جائے گا تو کیا اُس وقت آپ اشتراکی نظام کی خرابیاں بیان کر کے، لوگوں کو نظامِ سرمایہ داری قائم کرنے کی تلقین کریں گے؟ لیکن اس تلقین سے ہوگا کیا؟ جن مزدوروں کے ہاتھ میں آپ آج زمامِ اقتدار دے رہے ہیں، یہ بیچارے پھر حسبِ سابق محکوم و محتاج ہو جائیں گے اور سابقہ سرمایہ دار پھر برسرِ اقتدار آ جائیں گے۔

یہ ہے مارکسزم کے فلسفہ کا عملی نتیجہ! حقیقت یہ ہے کہ (اگرچہ یہ بات بظاہر کتنی ہی متضاد کیوں نہ دکھائی دے لیکن بادنیٰ تعمق انسان اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ) اشتراکیت کا فلسفہ بھی اسی قسم کا رجعت پسندانہ (RE_ACTIONARY) فلسفہ تھا جس قسم کے (غلط) فلسفے رجعت پسند طبقہ کی طرف سے اس سے پیشتر پیش ہوتے رہے ہیں۔ ایک وقت میں یہ فلسفہ پیش ہوا کہ بادشاہوں کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) حاصل ہیں، اس لئے دوسرے انسانوں پر ان کی اطاعت لازم ہے۔ یہ فلسفہ بھی "افیون" تھا کیونکہ عام انسانوں کو اطاعت پر مجبور قرار دیتا تھا۔ دوسرے وقت میں یہ فلسفہ پیش ہوا کہ دنیا میں انسان کا مقام اس کے سابقہ جنم کے اعمال کی رو سے متعین ہوتا ہے۔ جو شودر کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ اپنے سابقہ جنم کے بُرے اعمال کا نتیجہ بھگتنے کے لئے اُس درن میں جاتا ہے۔ جو برہمن کے ہاں جنم لیتا ہے، وہ اپنے سابقہ کرموں کا پھل پاتا ہے۔ ان میں سے نہ کسی نے یہ پوزیشن اپنے لئے خود متعین کی ہوتی ہے، اور نہ ہی اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ اس پوزیشن کو بدل سکے۔ شودر کا فریضہ ہے کہ وہ برہمن کی خدمت کرے اور برہمن کا حق ہے کہ وہ اس سے خدمت لے۔

اسی طرح غریبی اور امیری، رنج اور راحت، خوشحالی و بدحالی، صحت اور بیماری کو بھی لیکھ اور ریکھ (قسمت کی لکیر) سے وابستہ کر کے انسان کو اپنی حالت پر مطمئن رہنے کی تلقین کر دی جاتی تاکہ اُس کا خیال ان گوشوں کی طرف آنے ہی نہ پائے جو اس کی ان تباہیوں اور بربادیوں کے ذمہ دار ہیں۔ یہ کچھ سابقہ رجعت پسندوں نے کیا۔ اور اسی قسم کا فلسفہ مارکسزم نے پیش کر دیا کہ نظام ـــــ خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو ـــــ انسانوں کے ہاتھوں کا قائم کردہ نہیں، بلکہ تاریخی وجوب کا آوردہ ہوتا ہے۔ اس لئے انسان اس باب میں یکسر مجبور ہے۔ کہئے کہ اس فلسفہ میں اور سابقہ رجعت پسندوں کے فلسفہ میں کیا فرق ہے؟ اس وقت، اسے آپ اس لئے موجبِ خیر و برکت قرار دے رہے ہیں کہ اتفاق سے تاریخی وجوب کی گردش سے سابقہ سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو رہا ہے۔ لیکن کل کو جب دوسرے چکر کی باری آئے گی تو یہی فلسفہ مزدوروں اور غریبوں کے حق میں لعنت بن جائے گا اور انہیں اسی قسم کی افیون پلائے گا جس قسم کی افیون سابقہ رجعت پسند فلسفے پلاتے تھے اور جسے چھڑانا آپ بہت بڑا جہاد قرار دے رہے ہیں۔

یہ تو رہا اس سوال کا منفیانہ گوشہ۔ اب آئیے اس کے مثبت پہلو کی طرف۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانے پر نگاہ ڈالئے۔ وہ رجعت پسندانہ فلسفے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ساری دنیا پر مسلط تھے اور پورے شباب پر تھے۔ وراثتی ملوکیت اور بادشاہوں کے خداوندی اختیارات کا نظریہ۔ پیدائش کی رُو سے انسانوں کی ابدی تقسیم کا نظریہ۔ انسانوں کے

اوّلین "ماں باپ" کے گناہوں کی پاداش میں ہر انسانی بچہ کا اپنی پشت پر گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہونے کا عقیدہ - خوشحالی اور بدحالی کو تقدیر سے وابستہ کر دینے کا عقیدہ - غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو یکسر مجبور اور بے بس قرار دینے کا ہر نظریہ، انسانی فکر و نظر پر پوری طرح مسلط تھا ——— اور اگر مارکسزم کے تاریخی وجوب کے فلسفہ کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ دور وہ تھا جس میں سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط تھا جسے مارکسزم کے نظریہ کی رُو سے کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

اُس زمانہ اور ان حالات میں ایک شخص (علیہ تحیتہ والسلام) اُٹھتا ہے اور ساری دنیا سے للکار کر کہتا ہے کہ تمہارے یہ تمام نظریات باطل اور مفاد پرستانہ ذہنیت کے پیدا کردہ ہیں۔ تمہارا صاحبِ قوت و دولت طبقہ (گروہ مترفین) غاصبانہ نظام قائم کرتا ہے اور عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے "خدا" کی طرف منسوب کر دیتا ہے (یا آج کی اصطلاح میں اُسے تاریخی وجوب کہہ کر، عوام سے کہہ دیتا ہے کہ تم اسے بدلنے پر قادر ہی نہیں) وہ غاصبانہ نظام کے عاملین سے کہتا ہے کہ یہ سب تمہاری سازش ہے۔ تم غریبوں اور ناداروں کو خود ہی کچل کر رکھ دیتے ہو اور پھر ان کے متعلق کہتے ہو کہ اُن میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہ پیدا ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ بلند صلاحیت والے طبقہ کے خدمت گار اور اطاعت گزار رہیں۔ تم ان کے بچوں کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھتے ہو اور زندگی میں آگے بڑھنے کے تمام دروازے ان پر مسدود کر دیتے ہو، اور پھر یہ مشہور کرتے رہتے ہو کہ جاہل اور ذلیل رہنا ان کی تقدیر میں تھا۔ تم رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہو اور محتاجوں اور ناداروں سے یہ وعظ کہتے رہتے ہو کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو وہ تمہیں امیر کیوں نہ بنا دیتا

اُس (ذاتِ قدس و اعظم) نے ان مترفین سے یہ کہا اور غریبوں اور ناداروں کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے فریب میں نہ آجانا۔ یہ مستبدانہ اور غاصبانہ نظام ان لوگوں کا خود قائم کردہ ہے۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ رزق کے سرچشمے تمام ضرورت مندوں کے لئے کھلے رہنے چاہئیں۔ خدا اپنی فطری بخشائشوں کے راستے میں یہ تک نہیں لگا دیتا کہ ایک طبقے کو آگے بڑھنے دے اور دوسرے کے لئے راستہ روک دے۔ یہ جہان سعی و عمل ہے۔ یہاں قدر و قیمت سعی و عمل کی ہے پیدائشی نسبتوں کی نہیں۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ مفاد پرست گروہ اگر غلط نظام قائم کرتا ہے تو تم اس نظام کو الٹ سکتے ہو۔ یہاں کوئی تاریخی وجوب ایسا نہیں جو تمہیں اس نظام کو اُلٹنے سے باز رکھ سکے۔ اگر تم اپنی موجودہ پستی اور ذلت پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہو گے تو تمہاری حالت اور بھی پست اور ذلیل ہوتی جائے گی۔ اگر تم ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہو گے تو رزق اور اقتدار کے خزانوں کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں آ جائیں گی وسائلِ پیداوار کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہیں گی۔ لیکن دیکھنا! تم نے اُس وقت پھر غلط نظام قائم نہ کر دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری جگہ دوسری قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تمہارے صحیح نظام کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا محتاج اور محکوم نہیں ہو گا اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی باعزت طور پر پوری ہوتی رہیں گی اور محض انسان ہونے کی حیثیت سے ہر فرد کا احترام برقرار رہے گا۔ نہ کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوں گے اور نہ ہی دولت صرف اوپر کے طبقے میں گردش کرتی رہے گی۔ اس نظام کو اپنے حلقے تک ہی محدود نہ رکھنا اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا کیونکہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں، اس لئے اس باب میں اپنے اور بیگانے کا فرق کچھ معنی نہیں رکھتا۔

ہم پوچھتے ہیں اپنے اس کمیونسٹ نوجوان سے کہ کیا یہ تصور غریبوں اور کمزوروں کے لئے افیون ہے یا افیون زدہ انسان کو ہوش میں لانے کا تریاق ہے؟

اس کے بعد ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ مارکسزم کے مادی فلسفے کی رُو سے انسان اپنے ماحول (بلکہ معاشی نظام) کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس قسم کا ماحول (یا نظام) اسی خیالات کا حامل انسان — انسان اپنے ماحول سے آگے نکل نہیں سکتا ہے۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا یہ تصورات (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) اُس ماحول (بلکہ اُس زمانہ) کی پیداوار ہو سکتے ہیں جس میں یہ پیش کئے گئے تھے؟ کیا اُس زمانے میں کسی انسان کے حیطۂ خیال میں بھی یہ باتیں آ سکتی تھیں؟ کیا آپ تاریخ کی کوئی شہادت پیش کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں کسی اور نے بھی اس قسم کے نظریات اور نظام کا تصور دیا ہو؟ جب اس (عظیم شخصیتؐ) سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے ان تصورات کا سرچشمہ کیا ہے تو اس (صلعم) نے کہا کہ یہ میرے اپنے خیالات نہیں۔ مجھے ان کا علم خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے؟ ہم آپ سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں آپ کے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس کی رو سے آپ یہ کہنے کی جرأت کریں کہ اُس (بلند و بالا شخصیتؐ) کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) صحیح نہیں تھا۔ آپ کس بنا پر ایسا کہہ سکتے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ آپ ماورائے طبیعات (SUPRA PHYSICAL) کسی شے کو نہیں مانتے۔ اوّل تو یہ دیکھئے کہ یہ کون سی دلیل ہے کہ جس چیز کو آپ نہ مانتے ہوں اس کا وجود ہی نہ ہو؟ دوسرے یہ کہ جس چیز کو آپ تاریخی وجوب کہتے ہیں وہ کون سی طبیعاتی چیز (PHYSICAL THING) ہے؟ وہ بھی طبیعات سے بالا کوئی شے ہے۔ اور اُسے آپ اس قدر صاحبِ قوت مانتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص کہہ دے کہ وہ خدا کا قانون ہے جسے اس قسم کی قوت حاصل ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض کیوں سمجھی جائے؟

اب دیکھئے کہ تاریخی وجوب اور خدائی قانون میں فرق کیا ہے۔ تاریخی وجوب ایک اندھی قوت ہے جسے اس سے کوئی غرض اور واسطہ نہیں کہ انسانیت تباہ ہوتی ہے یا محفوظ رہتی ہے۔ اس نے صدیوں تک نظامِ سرمایہ داری قائم رکھا جس کے تابع مظلوم انسانیت بلکتی اور تڑپتی رہی لیکن اس نے اس نظام کو نہ خود ہی بدلا اور نہ ہی غریبوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ اسے بدل ڈالیں۔ اب اشتراکی نظام کی باری ہے۔ اس کے بعد پھر سرمایہ دارانہ نظام کی باری آ جائے گی۔ پھر انسانیت چیخے چلائے گی لیکن تاریخی وجوب ان کی ایک نہیں سنے گی۔ وہ ہزار کوشش کریں کہ اس غاصبانہ نظام کو نہ آنے دیں، وہ آ کر رہے گا۔

اس کے برعکس، قرآن مجید، نہ تاریخی وجوب کا جبر سکھاتا ہے اور نہ ہی مادی جدلیت کی گردشِ دولابی۔ وہ ایک غیر متبدل قانون دیتا ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ "دنیا میں وہ نظام باقی رہے گا جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو"۔ اس قسم کا نظام جو قوم جس وقت چاہے قائم کر سکتی ہے۔ قرآن مجید اس نظام کے خط و خال بھی بیان کرتا ہے اور اس قوم کے افراد کی خصوصیات بھی جن کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہو سکتا ہے اس باب میں انسانوں کو پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے اسے قائم کر لیں جب وہ قوم اسے قائم کرے تو (تاریخی وجوب جیسی) کوئی خارجی قوت ایسی نہیں جو اسے منہدم کر دے۔ انسانوں کے ہاتھوں ہی میں سے یہ قائم ہوگا اور انہی کی غفلت شعاری یا بے راہ روی سے یہ انحطاط پذیر ہوگا۔ اس کا نصب العین کسی خاص گروہ، خاص جماعت، خاص قوم یا خاص مملکت کی منفعت نہیں ہوگا۔ یہ النّاس کی منفعت کے لئے قائم ہوگا۔ یعنی عالمگیر انسانیت کی منفعت اس کا مطمحِ نظر ہوگا۔ "منفعت" میں صرف "روٹی" نہیں آتی۔ انسانیت کی پرورش اور نشوونما کے لئے جو کچھ درکار ہو، وہ سب اس میں شامل ہوتا ہے اس قسم کی منفعت سب کے لئے ہوگی اور بلا مزد و معاوضہ ملے گی۔

یہ ہے اس خدا کا متعین فرمودہ نظام جس سے ہمارے کمیونسٹ نوجوان اس طرح دور بھاگتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ قرآن مجید کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔

(مئی ۱۹۶۱)

مرتّبہ :- محمد اسلام، نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام، کراچی

نگہِ بازگشت

(راہگزرِ طلوعِ اسلام کے نمایاں سنگِ میل)

(قسط ششم)

اس سفرنامہ کی پانچ قسطیں طلوعِ اسلام بابت جولائی تا نومبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب چھٹی قسط پیشِ خدمت ہے۔ قارئین نے اس سلسلہ کو بڑا مفید قرار دیا ہے۔

مروّجہ اصطلاحات کا مفہوم متعیّن کیا جائے

آج کل ہمارا معاشرہ جس قسم کے خلفشار کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کی مثال کم ہی ملے گی اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آ جاتی ہے۔ معاشرہ میں جو خاص الفاظ یا اصطلاحات بالعموم استعمال ہوتی ہیں اگر ان کے معانی اور مفہوم متعیّن ہوں تو ذہنی انتشار پیدا نہیں ہوتا لیکن جب صورت یہ ہو کہ الفاظ اور اصطلاحات تو بارش کی طرح برس رہے ہوں اور ان کے نہ معانی متعیّن ہوں نہ مفہوم تو انتشار جھگڑے اور ادلوں کی شکل اختیار کر لے گا ـــــ مثال کے طور پر ان چند ایک الفاظ و اصطلاحات پر غور کیجئے جو ہم میں سے ہر ایک کی زبان پر ہیں اور سوچئے کہ کیا ان کا کوئی متفق علیہ متعیّن مفہوم بھی ہمارے ذہن میں ہے؟ اس طرف توجہ دلاتے ہوئے طلوعِ اسلام نے جون ۱۹۷۰ء (صفحہ ۲) کی اشاعت میں لکھا۔

اسلام

آج کل سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ، یا اصطلاح "اسلام" ہے۔ وہ کون سا عقیدہ، نظریہ، مسلک، نظام، پروگرام ہے جس کے ساتھ "اسلامی" کا لاحقہ نہیں لگا دیا جاتا لیکن آپ "اسلامی" سمجھنے والے کسی دو (عوام الناس نہیں) خواص سے پوچھ کر دیکھئے۔ یا تو اس کا کوئی متعین مفہوم ہی ان کے ذہن میں نہیں ہوگا اور یا ان کا مفہوم ایک دوسرے سے نہیں ملے گا۔ ان کے پیشِ نظر کوئی ایسا معیار ہی نہیں ہوگا جس سے اسلامی اور غیر اسلامی میں یکسر یا تمیز ہو سکے۔ جب ان دو کی یہ کیفیت ہے تو سات کروڑ میں جو ذہنی لشتنت ہوگا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اپنے اس بنیادی سقم کو چھپانے کیلئے ایک اور اصطلاح عام کر رکھی ہے یعنی :-

کتاب و سنت

کتاب تو ایک متعین کتاب ہے یعنی قرآن مجید۔ لیکن سنّت کی اصطلاح جس قدر مقدس ہے اتنا ہی اس کا مفہوم غیر متعین ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ہر حدیث سنّت ہے لیکن دوسروں کے نزدیک سنّت سے مراد حضورؐ کے صرف وہ اعمال ہیں جو آپؐ نے بحیثیتِ رسول اللہ سرانجام دیئے تھے (سنت کی یہ تعریف مودودی مرحوم کی ہے) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتیٰ کہ بخاری اور مسلم کا مجموعہ بھی نہیں۔ سنت کے متعلق دشواری اس سے بھی زیادہ ہے۔ حدیث کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جس میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہو کہ حضورؐ نے فلاں کام بہ حیثیت رسول اللہ کیا تھا اور فلاں کام شہری حیثیت سے۔ لہٰذا سنت کا بھی کوئی متفق علیہ مجموعہ امّت کے پاس نہیں۔ مودودی مرحوم نے کہا تھا کہ اس کا فیصلہ مزاج شناسِ رسولؐ کی نگاہِ بصیرت ہی کر سکتی ہے اور جماعت اہلِ حدیث کے امیر (مولانا محمد اسماعیل مرحوم) نے ایسے دعویٰ کو باطل قرار دیا تھا۔

کتاب و سنّت کی اصطلاح میں یہ بھی طے نہیں کہ دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے؟ نظری طور پر تو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی حیثیت بہرحال فائق ہے لیکن عملاً حدیث کو قرآن پر قاضی قرار دیا جاتا ہے یعنی جب کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں ٹکراؤ ہو تو فیصلہ حدیث کے مطابق ہوگا بعض اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

پاکستان میں اسلامی قوانین سازی کی بنیادی ذمہ داری اسلامی نظریاتی کونسل کی ہے اور اس کے بعد مرکزی حکومت کے شعبہ (یا وزارت) قانون (LAW MINISTRY) کی۔ آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ نہ نظریاتی کونسل کے پاس اور نہ ہی وزارت قانون کے پاس "سنت" کا کوئی ایسا مجموعہ ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ حتیٰ کہ وفاقی شرعی عدالت یا سپریم کورٹ کے پاس بھی نہیں۔ اس کے باوجود ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام امور کے فیصلے "کتاب و سنّت" کے مطابق کریں! یہ بات تعجب انگیز ہے یا نہیں؟

فقہ کے قوانین

اس کا حل انہوں نے یہ تلاش کیا ہے کہ،
فقہ کے قوانین نافذ کر دیئے جائیں، ہمارے مختلف فرقوں کی مختلف فقہیں ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ اپنی فقہ کو کتاب و سنّت کے مطابق قرار دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اس کا مطلب یہ ہے کہ "کتاب و سنّت" ایک ایسا سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے قوانین مل سکتے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ اہلِ حدیث حضرات سرے سے کسی فقہ کے ہی قائل نہیں۔ یہ ہیں وہ حقائق جن سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے۔ ان قوانین کا حشر کیا ہوگا اس کی مثالیں ابھی سے ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ مرکزی حکومت (زکوٰۃ کے متعلق) ایک پبلک لاء نافذ کرتی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج ہوتا ہے تو قانون کو تبدیل کر کے کہہ دیا جاتا ہے کہ ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق اس فریضہ کو ادا کرلے، ان میں سے ہر ایک کا عمل، اسلامی تسلیم کر لیا جائے گا۔
یا مثلاً مرکزی حکومت، نظریاتی کونسل اور وزارتِ قانون کی تصویب کے بعد سزا کا ایک قانون (رجم) نافذ کرتی ہے۔ اسی حکومت کی وفاقی شرعی عدالت اس قانون کو اسلام کے منافی قرار دے دیتی ہے۔ . . . . . اور ارادہ رکھتی ہے کہ سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دے۔ اب معلوم نہیں سپریم کورٹ کس کے فیصلے کو "کتاب و سنّت" کے مطابق قرار دے!

اس خلفشار کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ کسی نے "اسلامی یا غیر اسلامی کا معیار یا "کتاب و سنّت" کا متفقہ مفہوم متعین نہیں کیا۔ نہ ہی کسی ایسے ضابطہ کی نشاندہی کی ہے جس میں یہ معیار متفق علیہ طور پر موجود و محفوظ ہو۔ جن قوانین کے متعلق یہ کچھ ہو رہا ہے ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ان کی خلاف ورزی سے دنیاوی عدالتوں کی طرف سے سزا تو ملے گی ہی، انہیں خدا اور رسولؐ کے احکام قرار دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی معصیت سے آخرت میں بھی سزائے جہنم ملے گی۔ سوچیئے کہ جن قوانین کا تعلق اُمّت کے ایمان اور آخرت کی زندگی سے ہو کیا ان کی کیفیت ایسی ہی ہونی چاہیئے؟ اسلامی قوانین سے آگے بڑھیئے تو نظریۂ پاکستان کی باری آتی ہے۔

نظریۂ پاکستان

تشکیلِ پاکستان سے لے کر آج تک جتنی بار اس اصطلاح کو دہرایا گیا ہے اس کی تعداد حدودِ شمار سے باہر ہے لیکن کیا آپ نے کسی کی زبان سے آج تک سنا ہے کہ یہ نظریہ ہے کیا اور اس کا متعین مفہوم کیا ہے؟ پہلے تو یہ ایک نظری سوال تھا لیکن اب کہا جاتا ہے کہ اس نظریہ کی مخالفت کرنے والوں کو مملکت کا غدار تصوّر کیا جائے گا۔

ص۵ حکومت نے جدید وفاقی شرعی عدالت مقرر کی جس نے فیصلہ دیا ہے کہ رجم اسلامی حد ہے، یعنی ایک شرعی عدالت نے فیصلہ دیا کہ کتاب و سنّت کی رُو سے رجم کی سزا غیر اسلامی ہے اور اس کی جگہ دوسری شرعی عدالت نے کتاب و سنّت ہی کے مطابق اسے اسلامی قرار دے دیا۔

یہ بجائے خود ایسا ہی تصوّر کیا جانا چاہیئے۔ لیکن کیا یہ ضروری نہیں کہ پہلے یہ بتایا جائے کہ نظریۂ پاکستان ہے کیا؟ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ کسی نے اس کی مخالفت کی ہے یا نہیں۔ یہ تو قانون کا ابتدائی تقاضا ہے جس کا پورا کیا جانا نہایت ضروری ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو ملّتِ پاکستانیہ کے سامنے ہیں اور ان کے موجود ہونے سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ نظریۂ پاکستان کے سوا ان سب کا تعلق براہِ راست ہماری مذہبی پیشوائیت سے ہے۔ ان کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں۔ لیکن یہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے ٹیکنیک یہ اختیار کرتے ہیں کہ جونہی کسی نے اس قسم کا کوئی سوال اٹھایا، شور مچا دیا کہ یہ ملحد ہیں بے دین ہیں۔ مغرب زدہ ہیں۔ سیکولرازم کے حامی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ نعرے اس زور شور سے بلند کئے کہ وہ سوال اس شور میں دب کر رہ گیا اور یہ حضرات مطمئن ہو گئے کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ایسا کہنے والے کیا ہیں سوال یہ ہے کہ ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب دیا جانا ضروری نہیں؟

کیا یہ بتانا ضروری نہیں کہ:-

۱۔ کسی عقیدہ۔ نظریہ۔ مسلک یا قانون کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا متعیّن یا متفق علیہ معیار کیا ہے؟

۲۔ کیا اس کی وضاحت ضروری نہیں کہ سنتِ نبوی (علیہ التحیۃ والسلام) کا متعیّن مفہوم کیا ہے۔ اور وہ کون سی کتاب ہے جس میں یہ سنّت اس طرح محفوظ ہے کہ اسے سب سنّت تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ کیا یہ متفقہ طور پر طے کرنا ضروری نہیں کہ فقہی قوانین کی دینی حیثیت کیا ہے، اور آیا یہ ضروری ہے یا نہیں کہ شق (۱) کے مطابق انہیں بھی پرکھ کر دیکھ لیا جائے کہ وہ اسلامی ہونے کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟

مذہبی پیشوائیت سے قطع نظر، ہم ملک کے اربابِ دانش و بینش اور پاکستان کے بہی خواہ طبقہ سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ آئینی اور قانونی طور پر اس کا مطالبہ کریں؟ اس وقت تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ملک میں قانون سازی کے معاملہ کو محض جذباتی طور پر ہاتھ میں لے لیا گیا ہے اور ان مبادیات تک کو حقائق کی روشنی میں رکھے ہی نہیں کیا گیا جو اس باب میں شرطِ اوّل اور لابدی تقاضا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ قانون، قانون ہی نہیں کہلا سکتا جس کے مبادیات، تضمنات، حدود اور شرائط کو (DEFINE) اور متعیّن نہ کیا جائے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ڈر ہے کہ موجودہ خلفشار اور فکری انتشار مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دے گا۔ قوم کا نوجوان طبقہ اس صورتِ حال سے بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ جو بھی مذہب سے برگشتہ ہو، کمیونزم لپک کر، اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہے آپ

اقوامِ مغرب کی تاریخ پہ غور کیجئے وہاں سیکولرازم (جس میں مغربی نظامِ جمہوریت اور اشتراکیت دونوں شامل ہیں) لائی ہوئی ہی تھیاکریسی کی ہے۔ وہی تھیاکریسی اب یہاں بھی عام ہو رہی ہے۔ تو اس کا جو نتیجہ وہاں برآمد ہوا تھا وہی یہاں بھی برآمد ہو گا۔ تھیاکریسی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن قوانین کو مذہبی پیشوائیت، خدا کے احکام کہہ دے، انہیں جانچے، پرکھے بغیر، خدا کے احکام تسلیم کر کے ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی سخت مخالفت کی۔ نبی اکرمؐ نے اسے شرک قرار دیا۔ موسّسِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے اس سے محترز رہنے کی تاکید کی اور معمارِ پاکستانؒ نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ پاکستان میں ایسا نظام نافذ نہیں ہو گا۔ اس کے تخریبی نتائج ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس خطۂ ارض کو اس تباہی سے محفوظ رکھے۔

عوامی تحریک کے عناصر

ہمارے ملک میں عوامی تحریکیں کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں ان کی خصوصیات اور لوازمات کیا ہوتے ہیں وہ کس قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور انہیں کامیاب بنانے کے لئے کیا طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ ان کا تجزیہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے نومبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں لکھا۔

۱۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیشِ نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (CHAOS) پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے۔

۲۔ عوامی تحریک میں وہ عوام شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں۔ اور مستقبل کی طرف سے مایوس۔ اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے۔ یوں تو بنیادی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابنِ آدم کے کان میں "میری اور تیری" کا افسوں پھونکا تھا۔ لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (HAVE) اور (HAVE-NOTS) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے۔ عوامی تحریک چلانے والے اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (PRESENT) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذباتِ نفرت کو مشتعل کئے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار، معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر، اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں۔ اور عوام کے

دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار، اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں۔ ہم یا عوام اس کے ذمّہ دار نہیں۔

۳۔ اس تحریک کے علمبردار، حال کو اس قدر قابلِ نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اتنی قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محروموں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں وہ ان کے دلوں میں ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کر دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آگیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کسطرح مسرّتوں کے جھولے جھولتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا، تو وہ دیوانہ وار لپک کر اس کے پیچھے ہو لیں

۴۔ عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے، مستقبل کے فریب تخیّل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعیّن طور پر نہ کہی جائے۔ متعیّن اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ ان کے متبعین (FOLLOWERS) قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا تو وہ بد دل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ ——— وہ آئی، لو وہ آئی، دلِ ناصبور صبح ——— ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے سے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے ہیں انہیں جلدی سے مٹا دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (TEMPO) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور یہ اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دور نہیں ——— عوام سے کہا جاتا ہے کہ تم اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو پھر دیکھو کہ ہم کسطرح اس نظام کو کل ہی واپس لے آتے ہیں جسے دیکھنے کو تمہاری آنکھیں ترستی ہیں!

۶۔ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے۔ ——— ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

۷۔ عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد، وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پُر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم

کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کا شکار ہو رہے ہیں۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر، باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ، اپنی پارٹی کے بحرِ زخّار میں ڈوب کر، دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

۸۔ عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (THERMOS) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے، تو وہ اپنی "تنہائی" دور کرنے کیلئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں "سمجھ لیتے ہیں کہ ——— عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔"

۹۔ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے یہ امر لابدیک ہے کہ عوام کو مسلسل مصروفِ حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جائے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہوگا تو کسی دوسری عوامی تحریک ہی میں شامل ہوگا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغا آرائی کا۔ اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔

۱۰۔ مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے' ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے انگریزی زبان میں (FAITH) کہتے ہیں ——— عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ یہ حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں، ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

عوامی تحریک کی خصوصیات اور لوازمات کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد اس کے لیڈران کے خصائل بیان کرتے ہوئے لکھا۔

جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا ضروری ہے مثلاً:۔

۱۔ وہ اصول پرستی کی جگہ حکمتِ عملی کو اپنا مسلک قرار دے۔ یعنی وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جیسا مصلحت کا تقاضا ہو، بلا جھجک ویسا کر گذرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرا دے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

۲۔ اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس "کہہ مکرنے" کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

۳۔ وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو، خواہ اس کے لئے اسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں۔ اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا حسنِ عمل قرار پائے گا اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

۴۔ اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے نہ کسی دوسرے کی بات مانے وہ اپنے آپ کو ہمہ دان اور محیطِ کل سمجھے۔

۵۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود اور اس طرح اسے (ONE MAN SHOW) بنائے رکھے اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو کبھی بار نہ پانے دے جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہم دوش ہو جائیں گے۔

فنڈامینٹل ازم

اقوامِ مغرب کی "اسلام" کے فروغ کے سلسلہ میں مالی امداد پر نگہ بازگشت ڈالتے ہوئے طلوعِ اسلام نے جنوری ۱۹۸۳ء (صفحہ ۲۳) کی اشاعت میں لکھا تھا۔

"ہندو وہاری مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب کی یہ تثلیثی سازش آہستہ آہستہ زمین گیر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست تھی اور اقوامِ مغرب یہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں کہ ان کی یہ آہستہ خرامی رفتہ رفتہ جمود کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع شدہ "اسلام" کی شرابِ کہن کو نئی بوتلوں میں اسطرح بند کیا جائے کہ اصلی اور نقلی میں فرق نہ کیا جا سکے۔ اس نئی تحریک کا نام انہوں نے (FUNDAMENTALISM) رکھا جس کے لغوی معنی "بنیادی اسلام" کے ہیں۔ اس

تحریک کو انہوں نے اس قدر عام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں ہی نہیں یورپ، امریکہ کینیڈا تک میں۔ ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں اور وہاں کے نامور مذہبی پیشوا اور قدامت پسند پیشہ وران کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روپے کے سیلاب کے بند اسطرح کھول دیئے ہیں کہ سب اس میں بہے چلے جا رہے ہیں، جس اسلام کو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ لیکن اس کے لئے اسلوبِ بیان ماڈرن اختیار کیا جاتا ہے اس سے ہمارا وہ طبقہ جو "مولویوں" سے متنفر تھا ان کی باتیں کان لگا کر سنتا ہے۔ حالانکہ ان کی باتیں بھی وہی ہیں جنہیں مولوی صاحبان پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ تحریک روپے کے زور اور پروپیگنڈہ کے شور سے کامیاب ہو رہی ہے۔ خواص کی نگاہوں میں (ماڈرن ازم) کی چمک سے اس قدر خیرگی پیدا کی جا رہی ہے کہ ان میں حقیقت اور فریب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی اور عوام کے لئے مذہب کی رسمی تقریبات کو اس قدر پرکشش، بارونق اور مقدس بنایا جا رہا ہے کہ وہ ساحریت کے اس دامِ ہمرنگِ زمین سے نکل ہی نہیں سکتے۔

نظریۂ ضرورت

بیسوی صدی عیسوی میں اس دور کے ایک مجتہد اور اقامتِ دین کے داعی سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کو جب عملی زندگی کی اہم ضرورت پیش آئی تو انہوں نے اس نظریہ سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اٹھایا بلکہ اسے بڑے طمطراق سے پیش بھی کیا۔ ان کے چند رفقاء نے اسے جب ابن الوقتی سے تعبیر کیا تو ان کی جرأتِ بیباک نے اسے جنابِ رسالتمآبؐ سے منسوب کر دیا۔ مجبوراً ان رفقاء کو جماعت سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ طلوعِ اسلام نے مودودی (مرحوم) کی اس جرأتِ بیباک پہ تنقید کرتے ہوئے فروری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں لکھا۔

"نظریۂ ضرورت" درحقیقت سیکولرازم کا دوسرا نام ہے۔ سیکولرازم کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پہ خارج سے عائد کردہ کوئی پابندی نہیں۔ وہ اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہے۔ جیسا مصلحت کا تقاضا ہو ویسا کر لیا جائے۔ یہ ہے سیکولرازم یا نظریۂ ضرورت۔ شخصی حکومتوں میں ایسے فیصلے سربراہِ مملکت کرتا ہے، مغرب کے جمہوری نظام میں انسانوں کی اکثریت۔ اس کے بعد جہاں تک یاد پڑتا ہے "نظریۂ ضرورت" کی اصطلاح سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس انوار الحق صاحب نے استعمال کی تھی لیکن انہوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ یہ نظریہ اسلامی ہے۔ اس نظریہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی بحث، لاہور ہائی کورٹ کے چیف جج، جسٹس جاوید اقبال کے اس بیان سے ہوئی جو انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ "نظریۂ ضرورت" ایک اسلامی نظریہ ہے۔ اس کی سب سے پہلے وضاحت ایک مسلمان مفکر الماوردی نے کی تھی لیکن کم علمی کی وجہ سے لوگ اس نظریہ کو ایک غیر مسلم سے منسوب کر رہے ہیں۔

(جنگ لاہور۔ ۸ نومبر ۱۹۸۲ء)

اس پر طلوعِ اسلام نے لکھا تھا۔

"صدیوں کی غلامی سے قوم میں خود اعتمادی کے فقدان اور ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کے جو جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اس کا نتیجہ "تقلید" ہوتا ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ بجائے اس کے کہ مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق انسان خود تحقیق کرنے کے بعد پوری خود اعتمادی کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہنچے وہ اسلاف میں سے کسی کو بطور سند پیش کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے دعوے کے حق میں ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ الماوردی دربارِ عباسیہ (پانچویں صدی ہجری) کا ایک فقیہہ اور سیاست دان تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس کا کوئی قول یا نظریہ (اسلامی ہونے کی حیثیت سے) ہمارے لئے سند کیسے قرار پا سکتا ہے؟ مودودی (مرحوم) کے الفاظ میں "یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۲۷۴) الماوردی کا سند قرار پانا تو ایک طرف یہ بھی طے نہیں پا سکا کہ اس نے یہ کچھ کہا بھی ہے یا نہیں۔"

طلوعِ اسلام نے فروری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں لکھا۔

اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی ضرورت پیش آگئی۔ وہ اس طرح کہ نظریۂ ضرورت کو اسلامی ثابت کرنے کے لئے "قرآن کے ایک استثنا" کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ اسے پیش کیا گیا ہے وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس شیخ آفتاب حسین کی طرف سے۔ انہوں نے فرمایا ہے "نظریۂ ضرورت" کو قرآن مجید نے جائز قرار دیا ہے اور پوری اسلامی تاریخ میں "نظریۂ ضرورت" کارفرما نظر آتا ہے انہوں نے قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ موت سے بچنے کے لئے سؤر کا گوشت کھانا حلال ہے۔ یہ سؤر کا گوشت نظریۂ ضرورت کے تحت ہی حلال ہوتا ہے۔" جنگ لاہور (۱۰ نومبر ۱۹۸۲ء)

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

ع
زمن بر صوفی و ملاّ سلامے | کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

لیکن یہاں تو معاملہ "صوفی و ملاّ" سے بھی آگے چلا گیا ہے اس سلسلہ میں بصد ادب گزارش ہے کہ،

(۱) قرآن کریم نے "اضطرار" کا لفظ استعمال کیا ہے "ضرورت" کا نہیں۔ ضرورت کا لفظ تو سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ ضرورت اور اضطرار کا فرق عربی لغت سے واقف حضرات پر روشن ہے (جیسا کہ متعلقہ آیات کے ترجمہ کے سلسلہ میں پہلے لکھا جا چکا ہے)۔ مولانا محمود الحسنؒ نے اضطرار کا ترجمہ بے اختیاری اور لاچارگی کیا ہے۔ شاہ رفیع الدینؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے "پھر جو کوئی بےبس ہو جائے"۔

قرآن کریم کے انگریزی مترجمین نے اس کا ترجمہ (FORCED) اور (COMPELLED) کیا ہے۔ (LANE) نے اپنے لغت میں لکھا ہے (FORCED OR DRIVEN TO - AGAINST HIS WILL) ان تراجم اور معانی سے ضرورت اور اضطرار کا فرق واضح ہو جائے گا۔ قرآن مجید نے اس مجبوری اور بے بسی کو بھوک کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ یہ ایسا طبیعی تقاضا ہے جس سے متعلقہ شخص بھی محسوس اور معلوم کر سکتا ہے کہ اضطراری (مجبوری کی) حالت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں۔ اور دوسرے لوگ بھی اسے محسوس اور معلوم کر سکتے ہیں۔ برعکس اس کے "ضرورت" کوئی محسوس اور مرئی کیفیت نہیں۔ ویسے بھی ہر شخص کا "ضرورت" کا پیمانہ اپنا اپنا ہوتا ہے۔ ایک چیز ایک شخص کے نزدیک ضرورت ہے دوسرے کے نزدیک ضرورت نہیں۔ اگر حرام شئے کو حلال قرار دے لینے کا معیار اپنی اپنی ضرورت ہو تو معاشرہ میں جس قسم کی فوضویت (ANARCHY) پیدا ہو جائیگی ظاہر ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت خود دی ہے۔ کسی اور کو اس کا مجاز نہیں ٹھہرایا۔

(۳) اجازت صرف اس مخصوص حالت (بھوک کی وجہ سے مجبوری) کے ضمن میں ہے کسی انسان کو اس کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ اس اجازت کا سہارا لے کر اپنی ضرورت کے مطابق ہر ناجائز کو جائز قرار دے لے، محترم جسٹس اس قانونی نکتہ سے بخوبی واقف ہوں گے کہ کسی مقید قانون کو مطلق قرار دے دینے سے قانون کی حیثیت ہی کچھ نہیں رہتی۔ خود قرآن کریم نے بھی اس کے سوا کسی حالت کو اضطراری قرار نہیں دیا۔

(۴) جسٹس ممدوح نے فرمایا ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں نظریہ ضرورت کارفرما نظر آتا ہے۔ گزارش ہے کہ ہماری یہ تاریخ "اسلامی تاریخ" نہیں۔ یہ دورِ ملوکیت کی تاریخ ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ ملوکیت کا تمام کاروبار "نظریہ ضرورت" کے تحت چلتا ہے۔ اس میں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی ہوتی نہیں۔ صاحب اقتدار کی ضرورت اور مصلحت مملکت کا قانون قرار پا جاتی ہے۔ اس کے برعکس خلافت (اسلامی مملکت) قرآن مجید کی عائد کردہ پابندیوں کے دائرے میں گھری ہوتی ہے اور کسی مصلحت کے تحت بھی ان سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اقبالؒ نے ان دونوں میں بڑی وضاحت سے امتیاز کیا ہے جب کہا ہے کہ

خلافت بر مقام ما گواہی است	حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ	خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں:

ع ہنوز اندر جہاں آدم غلام است	نظامش خام و کارش ناتمام است صفحہ ۲۶
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم	کہ در دینش ملوکیت حرام است

(ارمغانِ حجاز)

اقبالؒ نے جو کہا ہے کہ "ہنوز اندر جہاں آدم غلام است" تو اس کا مطلب واضح ہے کہ دنیا

میں کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جو خدائی پابندیوں میں محصور ہو۔ ہر جگہ سیکولرازم۔ یعنی انسانوں کا خود ساختہ نظام قائم ہے جس کا کاروبار "نظریۂ ضرورت" کے تابع چلتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اس قسم کے نظریات ان فقہا اور سیاست دانوں کے تراشیدہ ہیں جو بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ (السلطان ظل اللہ علی الارض) قرار دیتے تھے۔ محراب و منبر پر ان کے اقتدار کے استحکام کی دعائیں مانگتے تھے جن کا فیصلہ یہ تھا کہ بادشاہ سے سوائے قصاص کے کسی جرم کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہاں تک کہ ان سے حشر میں بھی کسی جرم کی باز پرس نہیں ہوگی۔ اس قسم کے دور میں وضع شدہ نظریات کو اسلام کے لئے سند قرار دینا بڑی جرأت اور زیادتی ہے۔

اگر اسے سوءِ ادب نہ تصور کر لیا جائے تو ہم محترم چیف جسٹس سے دریافت کرنے کی جرأت کریں گے کہ اگر ہماری تاریخ میں نظریۂ ضرورت کارفرما رہا ہے اور اس نظریہ کو قرآن مجید نے جائز قرار دیا ہے۔ تو یزید کو کیوں مطعون (بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ) قرار دیا جاتا ہے؟ وہ بھی تو اسی اسلامی تاریخ کا ایک جزو تھا

ہم اپنے اربابِ علم و دانش کی خدمت میں باادب گذارش کریں گے کہ وہ اس قسم کے مسائل پر سیکولر نقطۂ نگاہ سے بحث کیا کریں۔ اسلام (غریب) کو درمیان میں نہ لایا کریں۔ ہم پہلے ہی اس کا کافی حلیہ بگاڑ چکے ہیں۔ اسلام کی بات اسلامی مملکت میں کرنی چاہیئے! اور اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں امتیاز قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں یہ کہہ کر دیا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۵/۴۴-۴۵-۴۷) جو بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ ظالم ہیں۔ فاسق ہیں۔

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اس کا بیشتر انہی خطوط کا رہین منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علوم حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے ــــ قیمت -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک ــ

حقائق و عبر

ہماری صحافتی سامریت

طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۸۴ء کے باب المراسلات میں لاہور ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ایک مذاکرہ کا ذکر آیا تھا جس کا عنوان تھا "علامہ اقبال اور مغربی جمہوریت"۔ اس میں کہا گیا تھا کہ محترم رفیق احمد باجوہ نے فرمایا کہ:-

> اسلام میں قانون سازی کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ (صفحہ ۵۶)

اس پر ہم نے لکھا تھا:

> ہم محترم باجوہ صاحب کو ہزار پابندیوں کے باوجود اس حق گوئی پر مستحق تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں اور لاہور ٹیلی ویژن کو خوش نصیب کہ اتفاقیہ ہی سہی، اس کے حلقوم سے بھی حق کی آواز نکلی۔ ہمیں امید ہے کہ اسے اس پر سجدہ سہو نکالنا نہیں پڑا ہوگا۔ (صفحہ ۵۶)

ہمیں ایک دوست نے کراچی سے روزنامہ نوائے وقت کا ۹ فروری ۱۹۸۴ء کا میگزین ایڈیشن بھیجا ہے۔ اس میں پروفیسر وارث میر صاحب کا ایک مقالہ بعنوان "سلطانیٔ جمہور کے مخالف کو شاباش" شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ رقمطراز ہیں:-

> محترم رفیق احمد باجوہ کو مبارک کہ انہیں محترم غلام احمد پرویز کے طلوع اسلام کی طرف سے شاباش ملی ہے۔ انہیں یہ شاباش ٹیلی ویژن مذاکرہ میں جمہوریت کی مخالفت کرنے پر دی گئی ہے۔ البتہ اس مبارک کے لئے جو جواز تلاش کیا گیا ہے وہ نہایت دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز ہے، اور مبارک دینے والوں کی سیاسی معلومات اور بصیرت پر ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔ فروری ۱۹۸۴ء کے باب المراسلات میں "جمہوریت کے بارے میں باجوہ صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔
>
> "ہم محترم باجوہ صاحب کو ہزار پابندیوں کے باوجود اس حق گوئی پر مستحق تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں اور لاہور ٹیلی ویژن کو خوش نصیب کہ اتفاقیہ ہی سہی، اس کے حلقوم سے بھی حق کی آواز نکلی۔ ہمیں امید ہے کہ اسے اس پر سجدہ سہو نکالنا نہیں پڑا ہوگا"

ایک دنیا جانتی ہے کہ ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام میں کوئی ایسی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور اگر کہہ دی جائے تو ٹیلی ویژن سے سنائی یا دکھائی نہیں دی جا سکتی جو حکومت کی حال یا مستقبل کی پالیسیوں سے متصادم ہو۔ ان دنوں موجودہ حکومت کو ایسے دانشوروں کی شدید ضرورت ہے جو جمہوریت کے خلاف بولنے یا لکھنے کیلئے تیار ہوں۔

ہم نے باجرہ صاحب کو مستحق مبارکباد اس لئے قرار دیا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ

اسلام میں قانون سازی کا حق کسی انسان کو حاصل نہیں۔ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔

اور لاہور ٹیلی ویژن کو اس لئے خوش نصیب کہا گیا تھا کہ وہاں سے پہلی بار یہ انقلابی آواز سنائی دی تھی۔

ہم نے تو یہ کہا تھا اور وارث میر صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس لئے مستحق مبارکباد قرار دیا کہ انہوں نے جمہوریت کی مخالفت کی تھی، اور جمہوریت کی مخالفت آج کل حکومت کے منشا کے عین مطابق ہے۔

وارث میر صاحب نے طلوعِ اسلام کے جس صفحہ کا اقتباس اپنے ہاں درج فرمایا ہے، وہیں یہ الفاظ بھی مسطور ہیں۔

"غلام پختہ کارے شو" کا مسلک تو مغربی جمہوریت سے بھی بڑھ کر خلافِ اسلام ہے۔ یہ تو کھلی ہوئی ملوکیت یا آمریت ہے۔ قرآن کی رُو سے عبدیت (غلامی) صرف خدا کی جائز ہے کسی انسان کی نہیں خواہ وہ کیسا ہی پختہ کار کیوں نہ ہو۔

لیکن انہوں نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ آپ نے صحافتی ساحریت کی شعبدہ بازی ملاحظہ فرمائی؟ ان حضرات کو اس کی توفیق تو نصیب نہیں کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی انسان کو نہیں) کہہ سکیں۔ اگر کہیں سے یہ آواز بلند ہوتی ہے تو ان کی انتہائی کوشش ہے کہ عوام کی نگاہ کا رخ یہ کہہ کر دوسری طرف موڑ دیا جائے کہ اس سے جمہوریت کی مخالفت مقصود ہے۔

اسی قسم کے تھے وہ اساتذہ جن کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا، لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ

اسلامی معاشرت

پرویز صاحب کی اس عام فہم کتاب میں زندگی کے روزمرہ کے امور کے متعلق قرآنی احکام ایسے سلیس اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں کہ اس سے بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بڑی آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے یکے بعد دیگرے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت -/۶ روپے علاوہ محصول ڈاک

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے مرکزی درسگاہ تو ادارہ طلوع اسلام (۲۵/B، گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (آجکل) ہر جمعہ کی صبح ۹½ بجے شروع ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل مقامات پر (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے۔

کراچی:- ہر جمعہ ۹½ بجے صبح دارالزہرہ بالائی منزل بالمقابل شاپ کیس نمبر ۲ سرمد روڈ (کراچی صدر)

گجرات:- ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر ۳۳۹۳۰ ، ۳۰۷۰

اوسلو:- (ناروے) ہر اتوار شام ۴ بجے بمقام:
MANZOOR AHMED, DOVREGATE-7 OSLO-1, NORWAY
TEL: 184325 & 223080

فریڈرکسٹاڈ:- (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار شام ۴ بجے بمقام:
ARNE SVENDSENS-GATE-?, 1600 FREDRIKSTAD,
NORWAY TEL: (032) 10287/22842

لندن:- (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار ۲ بجے بعد دوپہر بمقام
47 HURLEY ROAD GREEN FORD
MIDDLE SEX TEL: 01-578-5631

برمنگھم (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر
227/229 ALUM ROCK ROAD 38-3BH
(BIRINGHAM).

ٹورنٹو (کینیڈا):- ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح
335 DRIFT WOOD AVE: # 311,
DOWNS VIEW, TORNTO (ONT:) M3N-2P3, TEL: (416) 661—2827

اور ذیل کے مقامات پر عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لاہور	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ نزد پولیس سٹیشن فون نمبر:- ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No. 553—1896
پشاور چھاؤنی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر (بالمقابل VIP MAINGATE PESHAWARSTADIUM) باڑہ روڈ فون :- ۷۲۶۵۹
پشاور	جمعہ ۹ بجے صبح	شیریں محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن
مردان	جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ۔

نام بزم طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	بی-۶۶، لیاقت روڈ
لیہ	جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس، شہید روڈ لیہ
سرگودھا	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان نمبر ۴- نظامی منزل
فیصل آباد	جمعہ ½۳ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک، پی/۲۳ پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون نمبر: ۴۲۸۵۵)
ہنگو	جمعہ ½۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۴۷)
پنجکسی تحصیل کبیر والہ (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ملتان	جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ فون (۳۱۰۷۱)
بہاولپور	جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی جنرل شفاخانہ، ملتی پور، باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خاں صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطے کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، نوغی روڈ، باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ: چودھری مقبول شوکت صاحب گل روڈ (سول لائنز)
گجرات	جمعہ بعد نماز جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱۲/۱-اے بی- بھمبر روڈ، باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلال پور جٹاں	جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	(۱) جمعہ ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب، واقع 234-K-2 کیہال (ایبٹ آباد)
"	(۲) اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب K-355 گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)

سکوت و سکون کے ساتھ استفادہ کے خواہشمند حضرات کے لئے شرکت کی دعوت ہے